یکم و ۱۶ جون ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ۔ شمارہ نمبر: ۱۱۔۱۲

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

امریکا، اسرائیل سیاسی معرکہ آرائی اور غزہ جنگ

منصور جعفر

غزہ میں اسرائیل کی جنگ کے تقریباً نو ماہ جس متحرک امریکی امداد و حمایت کے ساتھ مکمل ہو رہے ہیں، کیا اس جنگ کا اختتام ایسے حالات میں ہوگا کہ امریکا کی حمایت اسرائیل کو حاصل نہیں ہوگی؟ اس سوال پر غور اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ امریکا کی جو بائیڈن انتظامیہ اور اسرائیل کی نیتن یاہو حکومت ان نو ماہ کے درمیان بظاہر اس وقت بدترین تعلقات سے گزر رہی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ہر طرف سیاست کا غلبہ اور اپنے اپنے سیاسی بچاؤ کی فکر دامن گیر ہے۔ جو بائیڈن اور نیتن یاہو کے ہاں سیاسی نفسا نفسی کا یہ عالم دیکھا نہ جائے کا ماحول ہے۔ حتیٰ کہ جنگی حکمت عملی، جنگی بیانیے، جنگ بندی کے منصوبے اور جنگی طوالت سب کے پیچھے سیاست کی کارفرمائی ہے۔

اگر امریکا اور اسرائیل کے تعلق، قربت، اتحاد اور مشترکہ اہداف کی کل عمر یہی کوئی آٹھ، نو ماہ یا چند سال کی تاریخ سے آگے نہ ہو تو امریکی انتظامیہ و اسرائیلی حکومت کی موجودہ صورت حال قابل توجہ ہے بلکہ قابل تشویش ہے۔ مگر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ امریکا و اسرائیل جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ ان کی قربت گہری اور قدیمی ہے۔ ان کے اہداف اور مقاصد واضح اور طویل المدتی ہیں۔

اس لیے کہ یہ مختصر دورانیے کے ڈرامے کی طرح کی ناراضی سے زیادہ معنی رکھنے والی بات نہیں ہو سکتی، تاہم یہ طے ہے کہ دونوں طرف کی سیاسی ضرورتوں اور وقتی مجبوریوں کے باعث اس برے ذائقے (Bad Taste) کے ماحول سے گزرنا پڑے گا۔

امریکا میں صدر جو بائیڈن کی انتظامیہ کو صدارتی انتخاب کا معرکہ درپیش ہے۔ اس وجہ سے محض عارضی و وقتی ضرورت اور تکلیف کا یہ سامنا دونوں طرف رہ سکتا ہے۔ بلاشبہ اپنے موجودہ مدمقابل ڈونلڈ ٹرمپ پر پچھلے صدارتی انتخاب کے دوران جو بائیڈن کو کوئی بہت بڑی برتری حاصل تھی، نہ ایسی علامات نومبر ۲۰۲۴ء کے صدارتی معرکے کے حوالے سے نظر آ رہی ہیں۔

صدر جو بائیڈن کی انتظامیہ نو ماہ کی غزہ جنگ میں اسرائیل کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو کر اب تک تقریباً ۳۷۵۵۰ سے زائد فلسطینیوں کی موت کے بعد بھی غزہ جنگ کے بارے میں پالیسی تبدیلی کا اشارہ نہ دیتی تو اپنے لیے سیاسی خودکشی کا راستہ منتخب کر رہی ہوتی۔

۲۲ جون ۲۰۲۴ء کے ایک تازہ عوامی جائزے کے مطابق امریکی ووٹرز میں جو بائیڈن اور ان کی جماعت کی مقبولیت ۴۰٫۷ فیصد ہے جبکہ ٹرمپ اور ان کی جماعت کی مقبولیت ۴۰٫۵ فیصد ہے۔ جو بائیڈن کی یہ پوزیشن بھی ان کی غزہ جنگ کے حوالے سے جزوی پالیسی تبدیلی کے اشاروں کے بعد ہے۔ جن میں سے ایک اشارہ بونگ ساختہ امریکی بموں کی رفح پر زمینی حملے سے پہلے ترسیل روکنے کے عبوری فیصلے پر مبنی ہے اور دوسرا اہم اشارہ غزہ میں جنگ بندی کے لیے جو بائیڈن کا ۳۱ مئی کو پیش کیا گیا 'روڈ میپ' ہے۔

یہ 'روڈ میپ' کیا ہے اس پر اگلی سطور میں بات ہو سکتی ہے مگر یہ طے ہے کہ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو پیش آئند صدارتی انتخاب کے لیے ڈیموکریٹ اور ری پبلکنز کے درمیان مقابلے میں اس خفیف سی برتری کا تاثر جو بائیڈن کی دل خوش کنی کے لیے شاید موجود نہ ہوتا۔

گویا یہ واضح ہے کہ غزہ کی جنگ اور فلسطینیوں کا مستقبل فی الحال جو بائیڈن کی سیاسی مصلحتوں، مجبوریوں اور ضرورتوں کے تابع رہے گا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انتخابی معرکے کے بعد جو بائیڈن کی اندرونی سیاسی مجبوریاں ممکنہ طور پر انتخاب جیتنے کی صورت میں موجودہ والی نہ ہوں گی۔

(فی الوقت ڈونلڈ ٹرمپ یا ری پبلکنز کے صدارتی انتخاب جیتنے کے امکان کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ایک پہلو پر بات کی جا رہی ہے۔)

اس تناظر میں بھی جو بائیڈن اور ان کی انتظامیہ بہت ہنر مندی سے کھیل رہی ہے اور اس نے اسرائیل کی غزہ جنگ کے لیے مدد و حمایت میں کوئی جوہری کمی کیے بغیر اپنے امریکی ووٹروں اور عالمی رائے عامہ کو پالیسی تبدیل کرنے کے سحر میں جکڑنے کی کافی حد تک کامیاب کوشش کر ڈالی ہے۔

اندرونی صفحات پر

- مغربی یونیورسٹیاں اور اسرائیلائزیشن کے خلاف مزاحمت
- اسلاموفوبیا اور بھارت کی موجودہ صورتحال
- اسرائیلیوں کے معیارِ زندگی کی قیمت کون چُکاتا ہے؟
- 'مصنوعی ذہانت' اور اُمڈتی تباہی
- مودی کی کامیابی، جنوبی ایشیا میں امریکی اسٹریٹجک پوزیشن

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

باوجود یہ کہ امریکا نے نہ صرف چند سو یا چند ہزار بوئنگ ساختہ بموں کی ترسیل کے علاوہ اسرائیل کے لیے اپنی فوجی امداد اور اسلحہ فراہمی میں قطعاً کوئی کمی نہیں کی ہے اور سات اکتوبر ۲۰۲۳ء سے لے کر مئی ۲۰۲۴ء کے اواخر تک ۱۲٫۵ ارب ڈالر کی فوجی امداد دینے کے لیے قانون سازی کی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ مئی میں جب امریکی صدر کا غزہ جنگ بندی کے لیے 'روڈ میپ' آ رہا تھا، اسی کے جلو میں امریکا کی طرف سے اسرائیل کو ۸٫۷ ارب ڈالر کی فوجی امداد کی منظوری دے دی گئی۔ اسی ماہ مئی کے دوران اسرائیل کے لیے ایف۔۱۵ طیاروں کی فراہمی میں رکاوٹ بنے ارکان کانگریس کو رام کیا گیا اور منظوری دلوائی گئی۔ ان طیاروں کی قیمت ۱۸ ارب ڈالر ہے۔

'مسلم بھی رہے راضی، یہودی بھی ناراض نہ ہوں'

امریکی صدر کا جنگ بندی 'روڈ میپ' بھی اگر دیکھا جائے تو یہ امریکا کی نو ماہ سے چلی آ رہی سفارتی و جنگی حکمت عملی سے ہٹ کر ایک 'آؤٹ آف باکس' آئٹم ہے۔ جس امریکا نے کم از کم تین بار غزہ میں جنگ بندی کو ویٹو کیا تھا۔ وہ اب 'جنگ بندی روڈ میپ' کی مارکیٹنگ کر رہا ہے۔

بلاشبہ یہ بھی جو بائیڈن انتظامیہ کی سیاسی مجبوریوں کا آئینہ دار ہے کہ اگر اسرائیلی فوجی ترجمان ریئر ایڈمرل ڈینیئل ہگاری کے الفاظ مستعار لے کر استعمال کیے جائیں تو یہ عوام کی آنکھوں میں ریت جھونکنے کے مترادف ہے۔

ایڈمرل ڈینیئل ہگاری نے یہ آنکھوں میں دھول جھونکنے کے بجائے ریت جھونکنے کی اصطلاح یقیناً صدر جو بائیڈن کے لیے نہیں بلکہ اسرائیل کی اپنی حکومت کے لیے اس کا نام لیے بغیر استعمال کی ہے، 'جو لوگ حماس کو ختم کرنے کی بات کرتے ہیں، وہ عوام کی آنکھوں میں ریت جھونکنے کی بات کرتے ہیں۔'

اسرائیلی فوجی ترجمان کے مطابق 'حماس ایک نظریہ ہے اسے ختم نہیں کیا جا سکتا'۔

اسرائیل کے اعلیٰ ترین فوجی ترجمان کا یہ بیان امریکی امداد کے ساتھ لڑی جانے والی غزہ میں اسرائیلی جنگ کے بارے میں آنکھیں کھول دینے والا تبصرہ ہے۔ اسرائیل اور امریکا نچلے ہو کر بیٹھ جائیں گے جبکہ غزہ کی جنگ کو اسرائیل اپنے وجود اور بقاء کا مسئلہ بنا چکا ہے اور امریکا مشرق وسطیٰ کو اپنے عالمی مفادات کے تناظر میں کسی صورت چھوڑ نہیں سکتا۔

لہٰذا ڈھاک کے تین پات کے مصداق امریکی صدارتی انتخابات کے بعد اگر جو بائیڈن دوبارہ صدر بن جاتے ہیں تو ان کی حکمت عملی جاری سیاسی مجبوریوں سے کافی حد تک بے نیاز ہو چکی ہو گی۔ اس لیے وہ ایک مرتبہ پھر امکانی طور پر پورے صہیونی کے انداز میں غزہ پر پلٹ کر وار کرنے کی کوشش میں ہوں گے۔۔ اگر جیت گئے!

اتفاق سے ادھر اسرائیل میں بھی غزہ جنگ کے نویں ماہ میں سیاست کا کھیل تیز تر ہو چکا ہے۔ سات اکتوبر کے بعد بھی اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کے خلاف عوامی احتجاج کی مختلف شکلیں موجود رہی ہیں، لیکن درمیان میں یہ احتجاج قدرے ٹھنڈا ہوتا دکھائی دیا تھا۔

اب بینی گینٹز کے جنگی کابینہ سے استعفے کے بعد اس میں تیزی نظر آ رہی ہے۔ ۲۲ جون کو ہفتے کے روز ڈیڑھ لاکھ اسرائیلیوں نے تل ابیب میں نیتن یاہو اور ان کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔ نئے انتخابات کا مطالبہ کیا، ان کی حکومت کو اسرائیل کے لیے خطرناک قرار دیا اور غزہ جنگ کی پالیسی سمیت ناکامی پر تنقید کی۔

ایک طرف ساحلی شہر تل ابیب پر عوامی احتجاج کی یلغار ہے اور وہ ۲۰۲۶ء کے متوقع عام انتخابات سے بہت پہلے نئے انتخابات کا مطالبہ کر رہے ہیں اور دوسری طرف اسرائیل کے دوسرے ساحلی شہر حیفا پر حزب اللہ کے راکٹوں، میزائلوں اور ڈرونز کی للکار ہے جبکہ یمن کے حوثی بھی بحیرہ احمر سے آگے بڑھ کر بحیرہ روم تک وار کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔

کٹر انتہا پسند یہودیوں کے لیے لازمی فوجی ملازمت سے استثنیٰ کا بل ابھی پارلیمان میں منظور ہونا باقی ہے۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑے سیاسی معرکے کا باعث بن سکتا ہے کہ اس بل کے خلاف نیتن یاہو کے اپنے وزیر دفاع کا ووٹ بھی آ چکا ہے۔ خود نیتن یاہو کے اتحادیوں کے ساتھ تعلقات اور اعتماد کی فضا بگڑ رہی ہے۔ عدالتوں میں نیتن یاہو کے خلاف کرپشن کیسز کی تلوار بھی مسلسل لٹکی ہوئی ہے۔

حتیٰ کہ خود اپنی پارٹی سے تعلق رکھنے والے اور غزہ جنگ کے کپتان وزیر دفاع کے ساتھ نیتن یاہو کے تعلقات مسلسل خراب ہو رہے ہیں۔ جس طرح ہفتے کے روز کے عوامی احتجاج میں پارلیمنٹ میں موجود ارکان کو 'چوہے' قرار دیا جاتا رہا۔ خود نیتن یاہو کا دفتر اپنے اسی وزیر دفاع کو حالیہ دنوں میں 'بے شرم اور احمق' قرار دے چکا ہے۔

اہم بات ہے کہ پینٹاگون نے اسرائیلی وزیر دفاع یوآو گیلنٹ کو نیتن یاہو کے ۲۴ جولائی کو کانگریس سے خطاب سے بھی پہلے اپنے ہاں بلا لیا ہے۔ یوآو گیلنٹ اپنے دورہ امریکا کو غزہ جنگ کے حوالے سے فیصلہ کن قرار دے رہے ہیں۔ اس کے برعکس نیتن یاہو ایک ویڈیو جاری کر کے اپنے لیے امریکا میں کئی سوالات تو خود ہی جنم دے چکے ہیں۔

اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح جو بائیڈن امریکا کے سیاسی بھنور میں ہیں۔ نیتن یاہو اسرائیلی سیاست کے منجدھار میں ہیں، مگر دونوں کی حکومتیں اپنے اپنے انداز میں اپنے اپنے سیاسی بچاؤ کے لیے فی الحال ایک دوسرے سے دوری اور ناراضی کو ہی اپنی سیاسی کمزوریوں کے ازالے کے لیے اکسیر سمجھتی ہیں۔

اس لیے ایک سیاسی انداز کی بیان بازی جو بائیڈن انتظامیہ نیتن یاہو کے بارے میں اور نیتن یاہو جو بائیڈن انتظامیہ کے بارے میں مفید خیال کر رہے ہیں۔ یہ کہنا سردست مشکل ہے کہ ان دونوں کے درمیان اس اظہار اختلاف پر کوئی خاموش معاہدہ موجود ہے یا نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ساری دنیا میں عام طور پر ظاہر ہوتی رہی ہے کہ انتخابات کی مہم کے دوران ایک دوسرے کو ہدف تنقید بنانے والے بعد از انتخابات باہم اتحادی بن جاتے ہیں اور شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا غزہ کی جنگ اس سیاسی کھیل اور ضرورت کے تحت عارضی طور پر اسی طرح کی سیاسی جمع تفریق کے تابع رہ سکتی ہے۔ جیسا کہ امریکی صدر جو بائیڈن کے روڈ میپ کے بارے میں بعض مبصرین کی رائے ہے کہ یہ سنجیدہ اور عملی پیش رفت کی خاطر کم جبکہ امریکی عوام اور عرب دنیا کو بیوقوف بنانے کے لیے زیادہ ہے۔

اصل پرت امریکا اور اسرائیل کے سیاسی منظر ناموں کی سمت واضح ہونے کے بعد کھلیں گے کیونکہ جو بائیڈن کا 'جنگ بندی روڈ میپ' بھی بجائے خود ڈونلڈ ٹرمپ کے تخلیق کردہ ابراہم معاہدے کا متبادل بنانے ہی کی کوشش ہے کہ اس کی کامیابی کے راستے نارملائزیشن کا عمل بھی آگے بڑھ سکے، مگر یہ جو سیاست کا دھندا ہے بڑا ہی گندا ہے۔

اس لیے یہ دکھتا نظر نہیں آتا کہ غزہ کی جنگ کا اختتام ایسے حالات میں ہو گا کہ اسرائیل کو امریکی حمایت حاصل نہیں ہو گی۔ جنگ بندی یا جنگی اختتام جب بھی ہو گا جنم جنم کے ساتھی ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں گے۔ جس طرح کہ دوران جنگ اس سے پہلے ہوتا رہا ہے۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۶ جون ۲۰۲۴ء)

مغربی یونیورسٹیاں اور اسرائیلائزیشن کے خلاف مزاحمت

Nick Riemer

اسرائیل کی جانب سے فلسطینیوں کی موجودہ نسل کشی واضح طور پر اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ امریکا و مغرب کی یونیورسٹیوں کی انتظامیہ سمیت اکثر عالمی ادارے فلسطینیوں کی نسل کشی کی راہ میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ ڈالنے سے انکاری ہیں۔ دوسری طرف یونیورسٹیوں میں بڑے پیمانے پر اس نسل کشی اور اس خونریزی سے نظریں پھیر لینے والی 'مغربی اکادمیہ' (اعلیٰ تعلیمی انتظامیہ) پر لازم ہے کہ وہ غزہ میں جاری تباہ کن جارحیت کے خلاف ایک زبردست مذمتی تحریک کھڑی کرے۔ بظاہر دکھائی دیتا ہے کہ اپنی عقل و شعور، تمام تر علم، تحریک کے اثر کا ادراک، ترقی پسندی، حالات سے واقفیت، اور حقوق کے تحفظ کی بحثیں ملا کر یہ اصحاب علم و دانش ایک پوری کی پوری ریاست کے ملیا میٹ کرنے سے نہیں روک رہے ہیں۔ اس تباہ کاری نے غزہ میں اعلیٰ تعلیم کے ڈھانچے کو مکمل طور پر زمیں بوس کر دیا ہے اور اکادمیہ اور طالب علموں کی نعشوں کے انبار لگا دیے ہیں، جن میں سے کئی ایک کے بے جان لاشے اب تک ملبے تلے دبے ہیں۔

اس غمزدہ کرنے والے ماحول میں دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں طلبہ کی جانب سے لگائے گئے 'غزہ یک جہتی کیمپس' میں یہ بات واضح طور پر نمایاں ہے کہ سیاسی شعور، حق کے لیے کھڑے ہونے کا عزم، اور صحیح غلط کی پہچان جیسے بنیادی اوصاف یونیورسٹیوں کے طلبہ و طالبات میں، یونیورسٹیوں کی انتظامیہ کے اہل کاروں اور ان کے اعلیٰ عہدے داروں سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں، جو بظاہر ان اصولوں کے مجاور بنے پھرتے ہیں۔ اور اب، جب اساتذہ کو آئینہ دکھایا جا رہا ہے، تو جواباً وہی علم و تحقیق کے دیوتا ان نہتے طلبہ پر تشدد کے لیے پولیس کو بلا لیتے ہیں۔

دیکھا جائے تو ان کا یہ ردعمل حیران کن نہیں ہے۔ پورے عالمِ مغرب کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اسرائیل کے لیے نرم گوشہ پایا جاتا ہے۔ یہ اسلحہ اور اس جیسے دیگر موضوعات پر تحقیق کو فروغ دیتے ہیں، جو نہ صرف جنگی جنون کو ہوا دیتی ہیں بلکہ اسرائیلی فوج کی فلسطینیوں کو نشانہ بنانے کی صلاحیت کو بہتر بنانے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں اسرائیلی اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ساتھ مضبوط دوطرفہ تعلقات کے قیام کے ذریعے، اسرائیلی جارحیت کے حق میں کام کرنے والے اداروں کو دنیا بھر سے توثیق دلوانے میں بھی کردار ادا کرتے ہیں۔ جیسا کہ متحدہ ریاست ہائے امریکا اور فرانس میں لگائے گئے طلبہ کے احتجاجی کیمپس سے اُبھرنے والے ردعمل سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنے حکمرانوں کے فیصلوں کے علاوہ ایک سوچی سمجھی تدبیر کے تحت اپنے اداروں میں فلسطین کے حق میں اٹھنے والی آواز کو دبا رہے ہیں۔ ایسا کرنے سے یہ اسرائیل کی اپنی یونیورسٹیوں میں ہونے والی سرگرمیوں کی ہی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ترقی پسندی کے نام پر اسرائیل کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنا بے نقاب ہو چکا ہے۔ اس امر میں جس چیز کا کلیدی کردار ہے، وہ نظریے کی آڑ میں ڈالا جانے والا دباؤ ہے۔ علاوہ ازیں اختیارات کا ناجائز استعمال اور دباؤ کی سیاست بھی اسے بڑھاوا دینے والے عناصر میں شامل ہیں۔

اگرچہ مغرب ہی میں چند ایک تعلیمی اداروں میں اسرائیلی جارحیت پر مزاحمت کی کچھ جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں، جیسے کہ ابرڈین، ٹورونٹو جیسی دیگر کئی یونیورسٹیوں کی جانب سے کی گئی 'سامیت مخالفت' (Anti-Semitism) کی تعریف تسلیم کرنے سے انکار، اسرائیل سے تعلقات جزوی طور پر منقطع کرنا، جو کہ حال ہی میں یونیورسٹی آف ٹورن، ناروے کی چار یونیورسٹیوں، اور امریکا میں پٹزر کالج نے نافذ کیا ہے۔ یا پھر کولمبیا اور دیگر امریکی یونیورسٹیوں کے منتظمین کے فیصلوں کے برعکس، آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں کا غزہ یک جہتی کیمپوں کو بند کرنے سے اب تک انکار۔ تاہم، ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد سے 'فلسطین یک جہتی کیمپس' پر ہونے والے شدید جبر اور مغربی اعلیٰ تعلیمی اداروں کے وائس چانسلروں، ریکٹروں اور صدور کی طرف سے اسرائیلی نسل پرستی کو مسلسل پیش کی جانے والے نظریاتی توثیق کے باوجود طالب علموں میں یہ مخالفت کم نہیں ہوئی۔

اگر یونیورسٹیوں کے ان اعلیٰ عہدے داروں میں سے چند (یا بہت سے) یقیناً صہیونی ہیں، یا صہیونیت نواز ہیں تو باقی اکثریت بھی واضح طور پر فلسطین کے حق میں اٹھنے والی آواز دبانے کو محض ایک ذمہ داری کے طور پر دیکھتے اور سمجھتے ہیں، جو ادارے کے سرپرست ہونے کی بدولت وہ خود پر خود بخود عائد سمجھتے ہیں۔ فلسطینی موقف کے حامی مظاہرین کی خاموشی کو تنظیمی استحکام، صہیونی مخیّر حضرات کو ناراض نہ کرنے کی خواہش، یا تہذیب کے تصورات جیسے الفاظ کا ملمع پہنا کر اسے قابلِ قبول حقیقت کی شکل دے دی گئی ہے۔ ایسے جواز جو سینئر تعلیمی منتظمین کے ضمیر کو کسی بھی قسم کی اخلاقی ذمہ داری کو نظر انداز کرنے کا جواز دیتے ہیں، جسے بصورت دیگر اگر وہ محسوس کرتے تو یقیناً خود کو تاریخ کے اوراق میں باطل کی فہرست میں موجود پاتے۔ اور تو اور، قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی اپنے عملے کو کٹھ پتلیوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

تحفظ کی آڑ میں نسل کشی

یونیورسٹیوں کے اعلیٰ عہدے داروں میں اپنے اداروں کے تحفظ کی بحث اب تحریک یک جہتی فلسطین کے خلاف کسی بھی حد تک تشدد کی پیمائش کے لیے گھڑا گیا جواز بن چکی ہے۔ یہ مطالبہ کہ نسل کشی کے خلاف احتجاج کو صہیونیوں کے 'تحفظ' کے لیے دبایا جائے، اسی استدلال کی ایک مثال ہے، جو اسرائیلی 'تحفظ' کی ضرورت کے ذریعے غزہ کو ملیا میٹ کرنے کا جواز پیش کرتی ہے۔ اسرائیلی یونیورسٹیوں میں یہودی طلبہ کی حفاظت کے نام پر فلسطینیوں کے ساتھ ظلم اور امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ جب کولمبیا یونیورسٹی کی مصری نژاد صدر منوشے شفیق نے قانون نافذ کرنے والی فورس کو اپنے طلبہ کے خلاف بلایا، تو اس کا جواز بھی صرف تحفظ تھا۔ آسٹریلیا میں، صہیونی تنظیمیں اس بنیاد پر ایک مشترکہ مہم چلا رہی ہیں کہ 'کیمپس یہودی طلبہ کے لیے غیر محفوظ ہیں'۔ ساتھ ہی ساتھ وہ فلسطینیوں کے خلاف 'دوسرے نکبہ' کا جواز بھی پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ صہیونیوں اور ان کے ہمدردوں کی طرف سے سوشل میڈیا پر اٹھائے جانے والے نکات میں سے ایک مغربی فلسطین کے حامیوں، خاص طور پر ہم جنس پسندوں کو غزہ جانے کی دعوت دینا ہے، جہاں ان کے خیال میں، حماس کی طرف سے انھیں تیزی سے نکالا جائے گا۔

ان دعوؤں میں موجود خطرات کے تصور کی جانچ کی جانی چاہیے۔ اسرائیلی نسل کشی کا دفاع کرتے ہوئے، نیو لبرل یونیورسٹی میں صہیونی اور ان کے اتحادی 'اسرائیلی یا یہودی تحفظ' کا ایک خود ساختہ تصور مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ 'تحفظ کا تصور' ایک ایسا جذبہ ہے جسے ایک علم کا پرستار تعلیمی اداروں سے حاصل کرنے کا پابند ہے بشمول ان دیگر مصنوعات کے جو وہ تعلیم کے نام پر خرید رہا ہے۔ اس تصور کے مطابق تحفظ،

یونیورسٹی کے برانڈ کے لیے ایک اور سیلنگ پوائنٹ بن جاتا ہے، جو کہ طالب علم صارف اور خریدار کو مطمئن کرنے کے لیے ایک پیداوار کی مانند ہے جو کہ کیمپس میں دن کے دوران ایک شاپر میں مفت آئس کریم اور کافی کے ساتھ دی جاتی ہے۔

کسی فرد کی شناخت صرف اسی صورت میں برقرار رہتی ہے، جب کہ شناخت دہندہ کسی ایسے معاشرے کا رکن ہو جس میں قوانین کی عمل داری کی شرائط وضع شدہ ہوں۔ گویا، تحفظ مکمل طور پر انفرادی احساس کا معاملہ نہیں ہوسکتا۔ بنیادی طور پر یہ ان شرائط اور قوانین پر مبنی ہونا چاہیے، جن کے ذریعے لوگ اجتماعی طور پر محفوظ رہ سکتے ہوں۔ وہ حالات کہ جن میں ایک معاشرہ زندہ اور خوشحال ہو سکے۔ سیاسی جبر، فرعونیت، بہتان اور جبری گرفتاری کا 'تحفظ کے نظریے' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی ایک ایسا معاشرہ جس میں نسل کشی کو غلط قرار دینے کی جرأت ایک جرم ہو جس کے لیے اسے نشانہ بنایا جاتا ہو، اور اس کی سلامتی کو داؤ پر لگایا جاتا ہو، وہ ترقی کی منازل کبھی طے نہیں کرسکتا۔

غزہ کے باسیوں کی نسل کشی پر خوش ہوتے صہیونی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ درحقیقت ان کی کمیونٹی محفوظ نہیں ہے۔ فلسطین کے حامی کیمپ کی عالمگیریت کے خلاف صہیونی چاہتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ اُن کی یک طرفہ یلغار کا جواز اوران کے تحفظ کا انحصار ہماری خاموشی پر ہے۔

فلسطین کی آزادی کے حامیوں کو 'سامیت دشمن' اور دہشت گردوں کے حامی قرار دے کر بدنام کیا جاتا ہے۔ لیکن دنیا میں شعور بڑھنے کی وجہ سے صہیونیت نواز اب اپنی سرگرمیاں کھلے عام نہیں انجام دے سکتے۔ لہٰذا فلسطینیوں کے ساتھ یک جہتی کی سیاست پر براہ راست حملہ کرنے کے بجائے، صہیونی عوامی طور پر دلیل اور جواب کے میدان سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ چونکہ جذبات کی بحث کوئی نہیں جیت سکتا، اس لیے وہ توقع کرتے ہیں کہ فلسطین کے حق کے علَم برداروں پر 'غیر محفوظ' ہونے کا الزام لگا دینے سے ان کے لیے اپنے سیاسی موقف کا دفاع کرنا آسان ہوجائے گا۔

ایک ایسی شناخت جس کو نسل کشی کی مخالفت سے خطرہ لاحق ہو، اس کا انصاف کے ساتھ تعلق ہرگز کسی کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ فلسطینیوں کے خلاف جنگ میں 'تحفظ' کو اپنے فیصلہ کن کارڈ کے طور پر لہرانا اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ صہیونیت نہ صرف ایک تشدد پر مبنی نسل پرست اور قتلِ عام کرنے والا نظریہ ہے، بلکہ فکری طور پر بھی ایک جاہلانہ تصور ہے۔

صہیونیت کے ہاں مضبوط دلائل کی تو کمی ہوسکتی ہے، لیکن جھوٹ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ البتہ ہمیشہ یہ شور وغل ضرور سنائی دیتا ہے کہ ''فلسطین کے حامی سام دشمن ہیں، غزہ میں جو ہو رہا ہے وہ نسل کشی نہیں ہے، اور اسرائیل نسل پرستی پر یقین نہیں رکھتا''۔ لیکن جب اختلاف کیا جاتا ہے، تو گرفتاریاں عمل میں لائی جاتی ہیں، اعلیٰ تعلیمی انتظامیہ کے عہدے داروں کو برطرف کردیا جاتا ہے اور طلبہ کو اداروں سے بے دخل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مکوئیری (Macquarie) کے دلیر اور ذہین فلسطینی وکیل عبدالفتاح، اور سڈنی یونیورسٹی کے علومِ سیاسیات کے ممتاز پروفیسر جان کین، اس وقت انھی وجوہ کی بنا پر شدید حملے کی زد میں ہیں۔ کیمپس تو امن کے شہر ہیں مگر وہ طالب علموں اور مایہ ناز استادوں کے لیے کتنے محفوظ رہ گئے ہیں؟ کیا سامیت نوازوں نے کبھی اس پہلو پر سوچا ہے؟

بائیکاٹ بطور تحفظِ جان

ایک طرف تو مغربی یونیورسٹیوں کے مدبرانہ، آزادانہ، عقلیت، لبرل، ترقی پسندی اور کثیر جہتی بحثوں جیسے تصورات ہیں۔ اور دوسری طرف ہتھیار بنانے والوں، اسرائیلی لابی کے مہروں اور فلسطین دشمن تجزیہ کاروں کے ساتھ تعلقات کی استواری ہے۔ ایسے میں اسرائیل کے لیے مغرب میں پائی جانے والی حمایت کے حوالے سے عوامی اعتماد کو برقرار رکھنے میں مغربی یونیورسٹیوں کے یہ تصورات کوئی خاص فیصلہ کن کردار نہیں ادا کرتے۔ یہ حقیقت تو بالکل واضح ہے کہ مغرب کی تاریخ خونریز نوآبادیاتی نظام اور دیگر جنگوں، نسل کشی، حراستی کیمپ، تشدد، بے لگام ماحول، انسانی تذلیل اور استحصال سے بھری پڑی ہے۔ لوگوں کے درمیان تعلقات کے کسی بھی منصفانہ یا معقول تصور میں بار بار مداخلت ہمیشہ سے مغرب کا خاصہ رہا ہے۔ البتہ جزوی طور پر مغرب اور اسرائیل میں یکساں طور پر یونیورسٹیوں میں ہونے والی نظریاتی سرگرمیوں کی بدولت لبرل معاشرے کے نظریاتی تصورات کی فضا میں مغرب کی نگرانی میں بنایا گیا 'قوانین پر مبنی ضابطہ' پھر سے اُڑان بھر رہا ہے۔

مغربی یونیورسٹیوں کی اسرائیلائزیشن کی مزاحمت کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اپنے اداروں کو ان یونیورسٹیوں سے دور کیا جائے جو جبری قبضے، نسل پرستی اور نسل کشی کے نظام کی آلہ کار ہیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فلسطین کمیٹی برائے اکیڈمک اینڈ کلچرل بائیکاٹ آف اسرائیل (PACBI) کے تحت ۲۰۰۴ء سے جاری اسرائیلی یونیورسٹیوں کے ادارہ جاتی تعلیمی بائیکاٹ میں شامل ہوا جائے، جیسا کہ کئی برسوں سے ہو رہا ہے۔ اور جیسا کہ دیگر سول سوسائٹی ایسوسی ایشنز اور اکیڈمک ٹریڈ یونینوں کی طرف سے بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۱۸ء سے مسلسل شائع ہونے والے اسرائیلی اخبار ہاریٹز (Haaretz) کے تازہ شمارے میں بائیکاٹ کے اقدامات پر اسرائیلی تعلیمی اداروں میں بڑھتے ہوئے خوف و ہراس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، اور بہت سے مضبوط شواہد فراہم کیے گئے ہیں کہ یہ بائیکاٹ اسرائیل میں اعلیٰ تعلیمی اداروں پر فی الواقع دباؤ ڈال رہے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ غزہ میں اسرائیلی جارحیت سے پھیلنے والی وحشت کو سامنے رکھتے ہوئے اسرائیلی یونیورسٹیوں کے بائیکاٹ کی اپیل غیر مؤثر معلوم ہوتی ہو۔ ایسی صورتِ حال میں تعلیمی بائیکاٹ کی ضرورت پر زور دینا، جب کہ غزہ کھنڈرات میں تبدیل ہو رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں اعلیٰ تعلیم کی یہ بحث بے سود لگے اور اپنی سیاسی نااہلی کا ملبہ اعلیٰ تعلیمی انتظامیہ کے سر پر لادا جائے۔ جب ایک خونریز نسل کشی جاری ہو، تو ایسی صورت میں یقیناً مزید ٹھوس مزاحمت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ادارہ جاتی اکادمی بائیکاٹ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود، اب بھی مغربی ماہرینِ تعلیم کی اکثریت کے سامنے یہ تعداد ایک اقلیت ہی سمجھی جارہی ہے۔ ماہرین تعلیم کے بائیکاٹ سے انکار کو کسی حد تک متوسط طبقے کی پیشہ ورانہ مہارت کو برقرار رکھنے کی روش کے شاندار فتنوں کے صرف ایک نتیجے کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ جس میں حد سے زیادہ احتیاط، سیاسی خاموشی و موافقت شامل ہیں۔ تاہم، بعض اوقات یہ ماہرین تعلیم کے پیشہ وری کی وجہ سے پیدا ہوجانے والی بدگمانی کا نتیجہ بھی ہوتا ہے، جو پرولتاری مقبولیت اور ادارہ جاتی احترام و خودمختاری میں کمی کی صورت میں نمایاں ہوئی ہے۔ معاصر یونیورسٹیوں میں ماہرین تعلیم کو بطور غیر ضروری استعمال کے تدریسی یا تحقیقی پرزے گردانے کا سلوک، اس بات پر کم ہی حیران کرتا ہے کہ وہ ماہرین اپنے اداروں پر اپنے سیاسی اثر ورسوخ کی صلاحیت کو کم تر سمجھتے ہیں۔ غزہ کی موجودہ تباہی اس المناک نتیجے کو نمایاں کرتی ہے۔ مغربی یونیورسٹیوں کے عملے میں فلسطین کے لیے حمایت میں معمولی اضافہ ہزاروں فلسطینیوں کی ہلاکت کے مقابلے میں کوئی بہت باوزن چیز نہیں ہے، تاہم قابلِ قدر ضرور ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۵

اسلاموفوبیا اور بھارت کی موجودہ صورتحال

سید سعادت اللہ حسینی

بھارت کے حالیہ انتخابات میں اسلام اورمسلمانوں کے تئیں خوف پیدا کرنے کو باقاعدہ سیاسی مہم کا حصہ بنایا گیا۔ اس تناظر میں، اسلاموفوبیا پر تین سال پہلے منعقد ایک سیمینار کی افتتاحی تقریر یہاں پیش کی جارہی ہے، اس امید کے ساتھ کہ قارئین اس بحث کو اور آگے بڑھائیں گے۔

اسلاموفوبیا کے موضوع پر منعقد ہورہے اس اہم سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مجھے خوشی ہورہی ہے۔ اسلاموفوبیا کا موضوع اس وقت ایک بڑا اہم موضوع بن چکا ہے بلکہ اسلام کے حوالے سے پیدا کیا گیا خوف اور توحش ہماری تاریخ کے اہم ترین چیلنجوں میں سے ایک ہے۔ اس وقت اسلاموفوبیا کے سلسلے میں کچھ اصولی باتیں پیش کرنا مقصود ہے۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے عملی طریقوں اور اس کے حل کی تفصیلات پر سیمینار کے دیگر شرکا اظہار خیال کریں گے۔

اسلاموفوبیا کیا ہے؟ اسلاموفوبیا دراصل زینوفوبیا کی ایک قسم ہے۔ زینوفوبیا(Xenophobia) کا مطلب ہوتا ہیا جنبیوں کا خوف یعنی جو لوگ نسلی، تہذیبی یا لسانی لحاظ سے مختلف ہوں اُن کے سلسلے میں خوف، غلط فہمی، بے زاری اور نفرت کو زینوفوبیا کہتے ہیں۔ یہ خوف خاص طور پر ان جگہوں پر پیدا ہوتا ہے جہاں باہر سے لوگ ہجرت کر کے آتے ہیں۔ ملک کے پرانے باشندے ان نو وارد بیرونی لوگوں پر شک کرتے ہیں۔ ان سے اپنی تہذیبی، نسلی یا قومی شناخت کو خطرہ محسوس کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھیں یہاں سے نکال باہر کیا جائے۔ اسی تناؤ کو زینوفوبیا کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے سلسلے میں جب زینوفوبیا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو وہ اسلاموفوبیا کہلاتی ہے۔ اس لیے اسلاموفوبیا کی اصطلاح کا استعمال بھی زیادہ تر ان ملکوں کے لیے کیا جاتا رہا ہے جہاں مسلمان گذشتہ صدی میں پہلی بار مہاجر کی حیثیت سے آئے۔ اس لیے ایک خیال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ہمارے ملک بھارت میں جو مسلم دشمنی کی کیفیت ہے وہ فرقہ پرستی (communalism) ہے، اسلاموفوبیا نہیں ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ہم آگے وضاحت کریں گے کہ غلط فہمیاں پھیلا کر اور اجنبیت پیدا کر کے اس ملک میں صدیوں سے رہنے والے مسلمانوں کے سلسلے میں بھی زینوفوبیا یعنی اسلاموفوبیا کی لہر پیدا کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں، جو اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب بھی ہیں۔

اسلاموفوبیا کو سمجھنے کے لیے اس سے متعلق کچھ اور اصطلاحات کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک اصطلاح ہے نسل پرستی (Racism) جس کا مطلب ہے کسی خاص نسل کی برتری کا تصور یا یہ تصور کہ اچھائی اور برائی، ذہانت وصلاحیت، شرافت وشائستگی اور اخلاقی خوبیوں کا تعلق نسل سے ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر کسی نسل کو ذہین و باصلاحیت، نافع و کارآمد اور شائستہ و با اخلاق سمجھنا یا کسی دوسری نسل کو کند ذہن، ناکارہ، اخلاق سے عاری، جرم پیشہ اور دشمن سمجھ لینا نسل پرستی کہلاتا ہے۔ ایک اور اصطلاح جو ہمارے ملک میں رائج رہی ہے وہ فرقہ پرستی (communalism) کی اصطلاح ہے۔ مذہب کی بنیاد پر بننے والے فرقوں کو محبت و نفرت کی اساس بنانا اور صرف اپنے فرقے کے مفاد کے بارے میں اور دوسرے فرقے کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچنا، دوسرے فرقے کو اپنا دشمن سمجھنا، دوسرے فرقے کی معاشی، سیاسی یا تہذیبی ترقی سے حسد کرنا اور اسے اپنے فرقے کے مفاد کے خلاف محسوس کرنا، فرقہ پرستی یا کمیونلزم ہے۔

ہمارے ملک میں تاریخی طور پر یہ دونوں مسائل ہمیشہ رہے ہیں۔ ایک کمیونلزم یعنی فرقہ پرستی اور دوسرا برادری واد (Castism) جو نسل پرستی یا (Racism) ہی کی ایک قسم ہے۔ ہمارا ملک ایک ہمہ تہذیبی ملک ہے۔ یہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں۔ یہ تنوع دوسرے ملکوں کے برعکس صرف بڑے کاسموپولیٹین شہروں تک محدود نہیں ہے بلکہ ملک کے ہر حصے میں، گاؤں گاؤں تک میں یہ تنوع پایا جاتا ہے۔ ایسے ہمہ تہذیبی سماجوں میں، الگ الگ تہذیبی پس منظر اور رہن سہن رکھنے والے گروہوں کے درمیان ٹکراؤ یا تصادم، کوئی غیر معمولی یا خلاف توقع بات نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں مختلف ذاتوں اور فرقوں کے درمیان تصادم کے واقعات ہوتے رہے ہیں۔ اکثر تصادم کے ان واقعات کے پیچھے معاشی یا سیاسی محرکات ہوتے تھے۔ کوئی گروہ معاشی طاقت حاصل کرتا ہے تو دوسرا گروہ اس کو اپنے لیے معاشی چیلنج سمجھتا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی لمبے عرصے تک یہی تاریخ رہی ہے۔ آزادی کے بعد تقسیم ہند کے نتیجے میں مسلمان یہاں کم زور ہوگئے اور اکثر اس طرح کے ٹکراؤ میں ان کا بھاری نقصان ہوتا رہا۔ ان کی طاقت کو توڑنے کے لیے، فرقہ وارانہ جذبات کا استحصال کر کے جگہ جگہ فسادات کرائے جاتے رہے۔ سیاسی کشمکش میں عوام کی ہمدردی حاصل کرنے یا مخالف سیاسی قوت کو کم زور اور بدنام کرنے کا آسان نسخہ بھی یہی سمجھا گیا کہ فسادات بھڑکا دیے جائیں اور ماحول کو تناؤ سے بھر دیا جائے۔

لیکن جس چیز کو ہم اسلاموفوبیا کہتے ہیں وہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ جیسا کہ کہا گیا، یہ اصلاً اجنبیوں کا خوف، ان پر شک، ان سے بے زاری و نفرت کی کیفیت کا نام ہے۔ مسلمان تو اس ملک میں اجنبی نہیں ہیں۔ نسلی لحاظ سے تو وہ بالعموم وہی پس منظر رکھتے ہیں جو دیگر بھارتی باشندوں کا ہے۔ رہن سہن کے بہت سے طور طریقے بھی مشترک ہیں۔ تہذیبی فرق یقیناً ہے لیکن یہ کوئی نئی پیدا شدہ کیفیت نہیں ہے۔ مسلمان اپنے تہذیبی تشخص کے ساتھ صدیوں سے یہاں آباد ہیں۔ اس لیے ان کی تہذیبی قدریں بھی اس ملک کے باشندوں کے لیے ایسی اجنبی نہیں ہیں کہ وہ یہاں زینوفوبیا پیدا کر سکیں۔ اس لیے یہاں اسلاموفوبیا کوئی فطری کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ منصوبہ بند طریقوں سے پیدا کردہ ایک مصنوعی صورت حال ہے۔

ہمارے ملک میں فرقہ پرستی تو صدیوں سے رہی ہے لیکن اسلاموفوبیا ایک نئی صورت حال ہے۔ فرقہ پرستی اور زینوفوبیا میں جوہری فرق پایا جاتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ فرقہ پرستی میں عام طور پر مفادات کی لڑائی ہوتی ہے۔ ایک فرقے کی ترقی یا اس کو ملنے والی مراعات سے دوسرا فرقہ خطرہ محسوس کرتا ہے تو اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوتا ہے۔ نقصان پہنچانے کی یہ کوشش عام سماجی اور سیاسی ہتھکنڈوں کے ذریعے بھی ہوسکتی ہے اور تشدد کے ذریعے بھی۔ چند بااثر لوگ سماج کے جرائم پیشہ افراد کو استعمال کر کے فساد بھڑکا دیتے ہیں۔ جس وقت تناؤ ہوتا ہے، عام انسانوں کے جذبات یا باہمی تعلقات پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے لیکن یہ اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ اس کے بالمقابل زینوفوبیا سماج کے ایک بڑے حصے میں مستقل پھیل جانے والے زہر کا نام ہے۔ فرقہ پرستی میں جذبات کا اشتعال عارضی ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ نارمل ہوجاتا ہے جب کہ زینوفوبیا ایک دیرپا کیفیت کا نام ہے۔ ہمارے ملک میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تھے

وہ زیادہ تر ملک کے چند علاقوں یا شہروں تک محدود ہوا کرتے تھے۔ فسادات کے موضوع پر تحقیقی کام کرنے والے ممتاز محقق، اشتیوش وارشنی نے تفصیلی اسٹڈی کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات اصلاً ملک کے چند شہروں کا مسئلہ ہے۔ زینوفوبیا کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ ایک وبا کے مانند ہے۔ جب پھیلتا ہے تو آبادی کے ایک بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں تشدد بھڑکانے کے لیے کسی منصوبے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تشدد اچانک بھڑک اٹھتا ہے۔ ایک عام آدمی بھی، اجنبی فرقے یا نسل کے فرد کو سامنے دیکھ کر اچانک مشتعل ہوسکتا ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تینوں طرح کی کیفیات موجود اور کارفرما ہیں۔ نسل پرستی بھی ہے اور احساس برتری کے شکار بعض نسلی گروہ، مسلمانوں کو بھی ایک نسل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ایک ایسی نسل جو ان کی بالاتری کی راہ میں مزاحم ہے، اس لیے وہ دشمن ہے۔ چنانچہ نسل کی بنیاد پر تعمیم (generalisation) کے تصورات عام ہیں۔ مسلمان گندے ہوتے ہیں۔ جارح ہوتے ہیں۔ وغیرہ۔ یہاں فرقہ پرستی بھی ہے۔ یعنی نسل کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا مذہبی وجود بھی وقتاً فوقتاً پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ اور اب زینوفوبیا کے طرز پر اسلاموفوبیا بھی پیدا کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں موجود فرقہ پرستی اور نسل پرستی کی جڑوں کو استعمال کرکے اسلاموفوبیا پیدا کرنے کی مسلسل اور منظم کوششیں ہورہی ہیں۔

اسلاموفوبیا کیسے پیدا ہورہا ہے؟ اس پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اسلاموفوبیا (جو زینوفوبیا کی ہی ایک شکل ہے) پیدا کرنے کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہاں اجنبی بنادیا جائے۔ انھیں ملک کی تہذیب، رسوم و رواج اور عقیدوں کے لیے بڑا خطرہ بنادیا جائے۔ اسلاموفوبیا کے جذبات جانے پہچانے گروہ کے سلسلے میں پیدا نہیں ہوسکتے خواہ اس سے کتنی ہی دشمنی ہو۔ یہ جذبات ایک اجنبی گروہ کے سلسلے ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ اجنبیت فطری بھی ہوسکتی ہے اور پروپیگنڈے اور منصوبہ بند دوری پیدا کرنے کے نتیجے میں بھی ہوسکتی ہے۔ یہ اجنبیت ہی اسلاموفوبیا کی جڑ ہوتی ہے۔ دور حاضر میں انسانوں کے حقیقی تعلقات بہت کم ہوگئے ہیں۔ ایک دوسرے کے بارے میں جاننے اور ایک دوسرے سے بات کرنے کا ذریعہ میڈیا بن گیا ہے۔ چنانچہ میڈیا کو کنٹرول کرلیا جائے تو یہ آسانی سے ممکن ہوجاتا ہے کہ جس کی جیسی چاہے امیج بنادی جائے۔ ہمارے ملک میں مسلمانوں کو اجنبی بنادینے کی کوششوں کی کئی سطحیں ہیں۔

ایک سطح وہ ہے جسے مکانی حاشیہ سازی (Spatial Marginilisation) کہا جاتا ہے۔ مکانی حاشیہ سازی کی متعدد قسمیں ہیں۔ ایک قسم گھیتو (ghetto) ہے، یعنی کئی شہروں میں فسادات کے ذریعے مسلمانوں کی بستیاں الگ تھلگ کردی گئی ہیں۔ پہلے یہ صورت حال شہروں تک محدود تھی، جہاں مسلمانوں کے گھیتو پائے جاتے تھے۔ اب دیہاتوں میں بھی یہ سلسلہ شروع ہوچکا ہے۔ اور ملک کے کئی علاقوں میں مسلم دیہات اور غیر مسلم دیہات الگ ہونے لگے ہیں۔ دوسری قسم انکلیو (enclave) کی ہے یعنی بڑے شہروں میں مسلمان تہذیبی وجوہات سے، یا موجودہ حالات کے دباؤ کی وجہ سے، تحفظ و سلامتی کے پیش نظر خود اپنے الگ علاقوں میں رہنا پسند کرنے لگے ہیں۔ تیسری کیفیت سلم (slum) کی ہے یعنی معاشی بنیادوں پر علیحدگی۔ مسلمانوں کی غریب آبادیاں، غربت و پس ماندگی کی وجہ سے الگ تھلگ علاقوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ لوگ ایک ساتھ نہیں رہیں گے اور الگ الگ ہوجائیں گے تو اجنبیت کے احساس کو تقویت دینا آسان ہوگا۔ اس وقت ایک طرف مسلمان بڑے پیمانے پر شہروں کی طرف ہجرت کررہے ہیں اور شہروں میں مذکورہ تینوں بنیادوں پر مسلمانوں کی آبادیاں غیر مسلموں کی آبادیوں سے الگ تھلگ ہوتی جارہی ہیں۔

دوسری سطح ادارہ جاتی دوری کی سطح ہے، الگ سیاسی جماعتیں، الگ تعلیمی و معاشی ادارے، الگ تجارتی علاقے و بازار، اس طرح الگ تھلگ ہوجانے سے بھی میل جول اور ایک دوسرے پر انحصار (Interdependence) کم ہوجاتا ہے اور اجنبیت پھر اسلاموفوبیا کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تیسری سطح ذہنی دوری کی سطح ہے۔ مذکورہ بالا دونوں طریقوں سے جسمانی دوری پیدا ہوجائے تو ذہنی دوری پیدا کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ ذہنی دوری کے لیے بہت سے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس کے لیے چند طریقے بہت کام یاب رہے ہیں۔ ایک تاریخ کا مخصوص بیانیہ جس کے ذریعے یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ مسلمان اس ملک کے لیے اجنبی ہیں۔ وہ ملک کو لوٹنے کے لیے آئے۔ ان کے آنے سے پہلے یہ ملک ایک سنہری تاریخ رکھتا تھا۔ انھوں نے اس ملک میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا کیں۔ اسے غربت و افلاس اور پسماندگی کی دلدل میں دھنسادیا۔ چنانچہ اس وقت عہد وسطی کی پوری تاریخ کو مسخ کرکے مسلمانوں کے ساتھ اجنبیت اور وحشت کو جوڑنے کی طاقتور مہم جاری ہے۔ اس کے لیے اس وقت کئی سطحوں پر کام ہورہا ہے۔ سنجیدہ علمی کاوشیں اور ان کے ذریعے تاریخ کی جھوٹ اور غلط بیانیوں کی اساس پر تدوین نو، پاپولر میڈیا یعنی فلم، پریس، سوشل میڈیا وغیرہ کے ذریعے اس تاریخ کو اور اس سے متعلق تصورات کو عوام کے لاشعور میں نقش کردینا اور سیاسی بیانیوں کے ذریعے ان کی یاددہانی اور تکرار کرانا، جیسی سبھی سطحوں پر مسلسل کوششیں ہورہی ہیں۔

ذہنی اجنبیت پیدا کرنے کے لیے دوسرا اہم وسیلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سلسلے میں یہ تاثر عام کیا جائے کہ وہ ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ یہاں کے لوگوں سے انھیں کوئی جذباتی اُنس نہیں ہے۔ ان کی وفاداریاں بیرونی ہیں۔ اس کے لیے بہت سی کہانیاں (narratives) تخلیق کی گئی ہیں جو عام کی جاتی ہیں۔

ایک اور وسیلہ مسلمانوں کے بعض مخصوص رواجوں یا عادتوں سے متعلق ہے۔ ان کو مبالغے اور تکرار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور یہ تاثر عام کیا جاتا ہے کہ مسلمان 'دوسرے' ہیں۔ ان کے رواج نہ صرف مختلف ہیں بلکہ اس ملک کے عوامی جذبات سے متصادم ہیں۔ اس میں سب سے کارگر معاملہ گائے کُشی کا رہا ہے۔ جسے اس وقت بھی ایک طاقتور آلے کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

ہمارے ملک میں جس فرقہ پرستی کا رواج رہا ہے، اُس میں کشمکش کی بنیاد عام طور پر سیاسی مسائل یا سماجی رویے رہے ہیں۔ مذہبی معتقدات کو تنازعے کی بنیاد بہت کم بنایا گیا۔ عام طور پر مذہبی عقیدوں کا احترام ہی رہا ہے۔ لیکن اسلاموفوبیا کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلام کی اساسیات اور دین کی بنیادی تعلیمات کے سلسلے میں خوف اور بے زاری کا رویہ پیدا کرتا ہے۔ یہ رجحان بھی اب خاصا عام ہوگیا ہے۔ سوشل میڈیا میں مسلمانوں سے متعلق ہر بحث اب ہمارے ملک میں بھی قرآن مجید یا نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی یا اسلام کی بنیادی تعلیمات کی ہجو پر ختم ہوتی ہے۔ دین اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنے کی مغربی روایت اب یہاں کے مباحث میں بھی عام ہونے لگی ہے۔ حجاب، حلال ذبیحہ، نماز وغیرہ جیسے شعائر کو لے کر جو اضطراب پیدا کرنے کی کوشش ہورہی ہے وہ بھی اسلاموفوبیا کے مخصوص مغربی رجحان کو بھارت میں درآمد کرنے کی دانستہ کوشش ہے۔ ورنہ تاریخی طور پر بھارت میں اس طرح کا اضطراب کبھی بھی نہیں رہا۔ یہ بھی اس بات کی

علامت ہے کہ اب فرقہ پرستی کے ساتھ اسلاموفوبیا بھی باقاعدہ رجحان بن چلا ہے۔

ہمارے ملک میں اسلاموفوبیا کے فروغ کے لیے کئی داستانیں گھڑی جارہی ہیں اور انھیں عام کیا جارہا ہے۔ مثلاً ایک اہم بیانیہ مسلم آبادی کا بیانیہ ہے۔ یہ تاثر پھیلایا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اسے منضبط نہ کیا گیا تو دوسرے بڑے گروہ اقلیت میں آجائیں گے یا مغلوب ہوجائیں گے۔ اسی طرح ایک اور بیانیہ 'امت کے تصور' کا بیانیہ ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کے تعلقات دوسرے ملکوں سے ہوتے ہیں۔ اس پر کنٹرول نہ کیا گیا تو وہ ملک کے لیے خطرہ بنیں گے۔ دہشت گردی کی عالمی بحث تو پہلے سے موجود ہی ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات اور جہاد کو خاص طور پر خوف پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لو جہاد اور کورونا جہاد جیسی اصطلاحات بھی اسی کا نتیجہ ہیں۔

مصنف اور ماہر عمرانیات ارجن اپودورائی نے زینوفوبیا کی نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بڑی اچھی اصطلاح 'ناقصیت کا اضطراب' (Anxiety of Incompleteness) استعمال کی ہے۔ یعنی خود کو نامکمل یا ناقص سمجھنے کا احساس اور دوسرے تہذیبی گروہوں کی موجودگی کی وجہ سے ایک نامکمل قوم ہونے کا احساس بعض اوقات شدید اندیشوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ بے چینی ہی نسل کشی (Ethnocide) اور دوسرے تہذیبی گروہوں کے افکار و خیالات سے شدید دشمنی اور ان افکار کو ختم کردینے کے جذبے (Ideocide)، کی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں ناقصیت کا یہ اضطراب عالمی سطح پر بھی کارفرما ہے اور ہمارے ملک میں بھی۔ اس اضطراب کو ختم کرنے کے لیے اعتماد پیدا کرنا ضروری ہے۔ اعتماد اسلام کے اصولوں کے تئیں بھی مطلوب ہے اور مسلمانوں کے وجود کے تئیں بھی۔

اصل سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کے مقابلے میں ہمارا ردعمل کیا ہو؟ اس سوال کے جواب میں ہمارے درمیان سوچ کی کئی دھارائیں پائی جاتی ہیں۔ اس پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنی حیثیت متعین کریں۔ ہم کیا ہیں؟ اگر ہم کوئی قوم ہوتے، کوئی نسلی یا لسانی گروہ ہوتے جس کی نسلی یا قومی شناخت پر حملہ ہوتا تو ہم وہ اسٹرٹیجی اختیار کرتے جسے جدید اصطلاح میں 'شناخت کی سیاست' (Identity Politics) کہتے ہیں۔ ہم اس مسئلے کو شناختوں کے تصادم (Identity Conflict) کے روپ میں دیکھتے۔ اپنی شناخت پر اصرار کرتے۔ اس کی بقا کی لڑائی لڑتے۔ وہ طریقے اختیار کرتے جو امریکا اور جنوبی افریقا میں سیاہ فام لوگوں نے اپنی نسلی شناخت کی لڑائی کے لیے اختیار کیے یا جو امبیڈکر نے دلتوں کو درپیش نسلی تفریق ختم کرنے کے لیے استعمال کیے۔

اگر یہ صرف سیاسی مسئلہ ہوتا اور ہمیں صرف سیاسی مخالفت کی وجہ سے اس مسئلے کا سامنا ہوتا تو ہم اپنی پوری توانائی اس کام پر مرکوز کردیتے کہ ہم سیاسی قوت حاصل کریں، دیگر طاقتوں کو حلیف بنا کر طاقتور سیاسی مورچہ کھڑا کریں یا اپنے حریفوں سے لین دین کر کے مصالحت کرلیں۔

اگر ہم باقی آبادی سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے اور ہم میں، ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا، یہ صرف وقتی جزوی تنازعات پر پیدا ہونے والا اختلاف ہوتا تو ہم صرف میل ملاپ کی کوشش کرتے۔ وقتی غلط فہمیوں کو دور کرتے۔ ملنے جلنے، ساتھ تیوہار منانے اور خیر سگالی کی باتیں کرنے سے مسائل حل ہوجاتے۔ اس وقت زیادہ تر جو فارمولے تجویز کیے جاتے ہیں وہ انھی تین چار باتوں پر مبنی ہیں۔ ان میں سے بعض باتوں کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ لیکن مسئلے کے حل کو ان تک محدود سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ یہ سولوشن کا حصہ ہوسکتے ہیں مکمل سولوشن نہیں بن سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام تدبیروں میں ہماری اصل پوزیشن کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ ہم نسلی اعتبار سے زیادہ تر اسی ملک کا حصہ ہیں۔ ہماری عظیم اکثریت کے آبا و اجداد اسی ملک کے تھے۔ یہیں کی زبانیں ہم بولتے ہیں۔ ہمارا رنگ روپ بھی ایک ہی ہے۔ گو کہ ہم اپنے آپ کو الگ نسل سمجھنے لگے ہیں اور دوسرے لوگ بھی مسلمان کا مطلب ایک نسل یا نسلی گروہ سمجھتے ہیں لیکن تاریخی حقیقت یہی ہے کہ ہماری عظیم اکثریت اسی ملک کی نسل سے ہے۔ یہاں اختلاف کی بنیاد ہماری نسل نہیں ہے۔ اس لیے نسلی یا قومی کشمکش کے نہ اصول ہم پر لاگو ہوتے ہیں اور نہ نسلی و قومی شناخت کی لڑائیوں کی نظیریں یا شناخت کی سیاست (Identity Politics) کے نمونے ہمارے لیے مفید ہوسکتے ہیں۔

ہمارا اصل امتیاز ہمارا عقیدہ اور ہماری سوچ ہے۔ یہی ہماری شناخت کی بنیاد ہے۔ قرآن مجید نے کہیں بھی مسلمانوں کے لیے قوم کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ قوم کا لفظ قرآن مجید نے عام لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے یعنی ان لوگوں کا مجموعہ جن کے درمیان نسل، زبان یا وطن کا اشتراک ہو۔ انبیا علیہم السلام نے خدا پر ایمان نہ رکھنے والے اپنے مخاطبین کو بھی یا قومی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے قرآن نے قوم سے ہٹ کر الگ الفاظ یعنی ملت، امت اور حزب یعنی پارٹی جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

''قومِ شعیب کے متکبر سرداروں نے کہا: شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے یا پھر تمھیں ہماری 'ملت' میں واپس آنا ہوگا۔ شعیب نے کہا: خواہ ہم اسے ناپسند کرتے ہوں تو بھی؟ اگر ہم تمھاری 'ملت' میں دوبارہ چلے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے''۔ (الاعراف:۸۸) اس آیت میں بیک وقت قوم اور ملت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ شعیب علیہ السلام اور ان کے مخاطبین دونوں ایک قوم کے فرد تھے البتہ ان کی ملتیں الگ الگ تھیں۔

ملت کا مطلب کیا ہے؟ ہم مسلمانوں کے لیے ملت کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن اسے بھی قوم ہی کے معنوں میں بولنے لگتے ہیں۔ ملت کے معنوں کی وضاحت قرآن کی ایک اور آیت سے ہوتی ہے۔ ''قائم ہوجاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی تمھارا یہی نام ہے۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ بنو''۔ (الحج:۷۸)

اس سے قوم اور ملت کا فرق اور واضح ہوجاتا ہے۔ قوم ایک نسلی گروہ یا کسی جغرافیائی علاقہ میں رہنے والے لوگوں کا نام ہے۔ (یا موجودہ دنیا میں کسی ریاست کے باشندوں کا مجموعہ ہے) اپنی قوم کا اکثر انتخاب نہیں کیا جاتا، وہ فطری اور پیدائشی طور پر متعین ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل جب ہم حزب یا پارٹی بولتے ہیں تو اس سے ایک گروہ مراد ہوتا ہے جو کسی خاص مشن کی خاطر تشکیل دیا گیا ہے۔ جس کی رکنیت رضا کارانہ ہے، جو اس مشن سے اتفاق اور وابستگی پر مبنی ہے۔ پارٹی کا اپنا اجتماعی وجود ہوتا ہے لیکن وہ قوم سے بالکل الگ نہیں ہوتی بلکہ قوم کے اندر ہی اپنے مشن کے حصول کے لیے کوشاں ہوتی ہے۔ حزب یا پارٹی ہی کی طرح ملت بھی ایک نظریاتی گروہ کا نام ہے۔

ملت اسلامیہ کے لیے قرآن نے جو دیگر اصطلاحات استعمال کی ہیں، وہ بھی انھی معنوں میں ہیں۔ امت کا لفظ قرآن میں مسلمانوں کے نصب العین کی وضاحت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا اور كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ جیسی آیتیں ہم بار بار

پڑھتے اور سنتے ہیں جن میں امت کا لفظ مسلمانوں کے مشن اور مقصد کی وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کوئی قوم یا نسل نہیں بلکہ ایک مشن اور نصب العین رکھنے والا گروہ ہیں۔ جب ہم مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتے ہیں تو ساتھ رہنے والے دیگر افراد ان کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ غیریت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا الگ گھیتو بنا لیتے ہیں۔

اگر ہم اپنے مقام و حیثیت کے سلسلے میں کنفیوژن دور کرلیں تو اسلاموفوبیا کے اس مسئلے کے حل کی راہیں بھی ہم پر روشن ہوں گی۔ اسلام ایک نظریے اور ایک سوچ کا نام ہے۔ نظریے یا سوچ کے حوالے سے پیدا ہونے والے یا پیدا کیے جانے والے خوف کا حل صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس نظریے کی وضاحت کی جائے۔ یہاں لوگ ہم کو ایک علحدہ یا اجنبی گروہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ ہماری کوشش اس کے مقابلے میں یہ ہونی چاہیے کہ ہم یہ اصرار کریں کہ ہم کوئی اجنبی گروہ نہیں ہیں۔ ہم اس ملک کا حصہ ہیں۔ نسل، زبان، جغرافیائی وطن، ان سب حوالوں سے یہاں کے لوگوں کے ساتھ ہمارا اشتراک ہے۔ ہم یہاں کے انسانوں کے حریف یا دشمن نہیں بلکہ ان کے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ ہم جس دین یا نظریے میں یقین رکھتے ہیں وہ یہاں کے انسانوں کے لیے بھی رحمت کا پیغام ہے۔ یہ دین کسی خاص نسل یا خاص گروہ کا مذہب نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ تمام انسانوں کے لیے مفید ہے۔ اسے جان کر اور سمجھ کر آپ چاہیں تو اس سے اتفاق کریں یا اختلاف کریں، لیکن اس دین کی وجہ سے اس کے ماننے والوں کو اجنبی سمجھنے کا کوئی جواز نہیں۔ وہ آپ کے اپنے ہیں اور آپ کی بھلائی ہی کے لیے اس دین کی طرف بلا رہے ہیں۔

ہم اپنے اس مقام اور حیثیت کو سمجھیں تو معاملہ چاہے دعوت دین کی بنیادی ذمے داری کا ہو یا اسلاموفوبیا کے خاتمے کا، دو اہم کام انجام دینا ضروری ہیں۔ ایک ملک کی آبادی سے جڑنا اور اجنبیت (Otherness) کے احساس کو ختم کر کے خیر خواہی کا اعتماد پیدا کرنا اور دوسرا ملک کے سامنے اسلام کا صحیح تعارف کرانا اور اسلام کے سلسلے میں غلط فہمی، شک، خوف اور نفرت کو ختم کرنا۔

ان سب حوالوں سے رائے عامہ کو مثبت طریقے سے متاثر کرنا ہی اسلاموفوبیا کا علاج ہے۔ رائے عامہ کی تبدیلی، اہل اسلام کا اہم ترین اقدامی ایجنڈا (Proactive Agenda) بھی ہے اور دفاعی ایجنڈا (Defensive Agenda) بھی۔ اقدامی اس لیے کہ مسلمان کی اصل حیثیت داعی الی اللہ کی ہے اور رائے عامہ کی اسلام کے حق میں تبدیلی داعی الی اللہ کا ایک اہم ہدف ہوتا ہے۔ دفاعی اس لیے کہ اس وقت اسلام دشمن طاقتوں کا بنیادی ایجنڈا اسلام کو بدنام کرنا اور اس کے تعلق سے غلط فہمیاں اور توحش پیدا کرنا ہے۔

ملک کی رائے عامہ پر اپنے نقطہ نظر سے اثر ڈالنے کے لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہمارا گہرا تعلق ملک کے عام سماج سے ہو۔ اسلاموفوبیا کی تحریک کا سب سے اہم ہدف یہ ہے کہ آپ کو اجنبی بنا دیا جائے۔ آپ اجنبی بن جائیں گے تو آپ کی سوچ کا کوئی اثر باقی ملک پر نہیں پڑے گا۔ بار بار یاد دلانے کی بات یہ ہے کہ ملک کے معاشرے سے ہمارا وہی تعلق ہونا چاہیے جو انبیا علیہم السلام کا اپنی قوموں سے تھا۔ قرآن نے پیغمبروں کے سلسلے میں ''قوم کے بھائی'' یا ''ان کی برادری کا فرد'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا اس نے کہا ''اے برادرانِ قوم، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے''۔ (الاعراف:۶۵) قرآن نے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں متعدد جگہ یہ بات کہی ہے کہ وہ اپنی قوم کے خیر خواہ تھے۔ اور ان کی خیر خواہی پر ان کی قوم کو اعتماد تھا۔ جیسے: ''تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمھارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے''۔ (الاعراف:۶۸) قولی دعوت کے آغاز سے پہلے مدعو قوم کے درمیان نبی کریمؐ کی یہ امیج بن چکی تھی کہ آپ اپنی قوم کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، اُس کے خیر خواہ ہیں اور اُس کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

ہم بحیثیت ملت، اس ملک کی اکثریت سے کمیونکیشن کی ضرورت کو سمجھیں اور اس کی صلاحیت پیدا کریں۔ ہمیں ان کے ذہن کو بھی سمجھنا ہے اور اپنا ذہن ان کو بھی سمجھانا ہے۔ اب بڑے پیمانہ پر برادران وطن سے ربط و تعلق، ان سے بامعنی ڈائیلاگ اور ان کے ساتھ اشتراک ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان ان کے مسائل میں بھی دلچسپی لیں اور مشترک مقاصد کے لیے ان کے ساتھ مل کر کام کریں۔ یہ کام ہر سطح پر ہونا ہے۔ دانشوروں اور مصنفین کی سطح پر، سماجی کارکنوں اور سول سوسائٹی کی سطح پر، مذہبی قائدین کی سطح پر، عام محلوں، کالونیوں اور دیہاتوں میں عوام کی سطح پر، خواتین کے درمیان، خاندانوں کے درمیان، نوجوانوں کے درمیان، وغیرہ۔

مہماتی انداز میں ہم سب کو مل کر کوشش کرنی چاہیے کہ ہر سطح پر ایسے مستحکم تعلقات قائم ہوں کہ اسلام کیا ہے، یہ لوگوں کو میڈیا کے ذریعے معلوم نہ ہو بلکہ ہمارے ذریعہ معلوم ہو۔ ہمارے قول اور عمل سے اسلام سمجھ میں آئے۔ اسلاموفوبیا کا ایک بڑا سبب، 'میڈیا پر منحصر اسلام کا عوامی شعور' (Media Dependent Public Understanding of Islam) ہے۔ اسے بدلنے کا طریقہ یہی ہے کہ انسانی رابطہ بہت زیادہ بڑھ جائے۔ راست رابطے سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ ہر ایک کے لیے زیادہ یقینی ہوتی ہے۔ میڈیا یا تھرڈ پارٹی انفارمیشن وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں راست رابطہ نہیں ہوتا۔ اس لیے راست رابطہ بڑھایا جائے۔ کمیونکیشن میں ان امور کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو اسلاموفوبیا کی بنیاد بن رہے ہیں۔ تاریخ کے سلسلے میں تاریخی حقائق واضح ہوں۔ جہاد، خواتین وغیرہ کے سلسلے میں اسلامی احکام کی معقولیت واضح ہو۔ اس کے لیے علمی کام بھی ہو، میڈیا مباحث بھی ہوں، سوشل میڈیا پر بھی کوششیں ہوں اور فلم، کارٹون، کامیڈی جیسے عوامی میڈیا کا بھی استعمال ہو۔ یہ سب کام ہم کو کرنے ہوں گے۔ پھر اپنے ذاتی کردار، اپنے خاندانوں اور اپنے اداروں سے اسلام کی عملی شہادت اور اسلام کے عملی نمونوں کو بھی سامنے لانا ہوگا۔ ملک میں اس وقت جگہ جگہ جماعت کے مختلف ادارے بلاسودی مائیکرو فنانس کے فروغ کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اس سے اسلامی معاشیات و مالیات کی برکتیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ ایسی کوششیں مختلف میدانوں میں کرنی ہوں گی۔ تاکہ لوگوں کو سمجھ میں آئے کہ اسلام کی تعلیمات سارے انسانوں کے فائدے کے لیے ہیں۔

ان سب کاموں کو انجام دینے کے لیے ہمیں خود کو کئی پہلوؤں سے بدلنے کی ضرورت ہے۔ اپنی حیثیت و مقام کا ہم شعور حاصل کریں، خود دین پر عمل کرنے والے اور دین کا اچھا نمونہ بنیں۔ سیاسی لحاظ سے مضبوط ہوں اور تعلیم و معیشت میں ترقی کریں۔ ملک اور سماج کو دینے والے (Contributor) بنیں۔ جذباتیت کا شکار ہوئے بغیر اپنی ترجیحات بھی متعین کریں اور ان پر صبر کے ساتھ لمبی جدوجہد کے لیے تیار ہوں۔ انھی سب باتوں سے ہمارے اندر وہ طاقت پیدا ہوگی جو اس وسیع الاطراف مسئلے کے مقابلے کے لیے ضروری ہے۔

اس بحث سے درج ذیل اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

اسلاموفوبیا، زینوفوبیا کی قسم ہے۔ زینوفوبیا اجنبیوں سے خوف کا نام ہے۔ زینوفوبیا، نسل پرستی اور فرقہ پرستی تین الگ الگ چیزیں ہیں۔

باقی صفحہ نمبر ۱۵

اسرائیلیوں کے معیارِ زندگی کی قیمت کون چُکاتا ہے؟

افتخار گیلانی

مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل ایک جزیرے کی مانند ہے، جو انفرااسٹرکچر اور معیارِ زندگی کے حوالے سے اس کے ایشیائی پڑوسیوں کے برعکس کسی یورپین سرزمین کا حصہ لگتا ہے۔ بلچل سے بھرپور شہر تل ابیب سے غزہ کی سرحد سے متصل شہر نگار سدیرات کی طرف سفر کرتے ہوئے یہودی علاقوں میں ریتیلے ٹیلوں کے بجائے ہریالی نظر آتی ہے۔

اسی طرح شمال میں جبل الکرمل کے دامن میں حیفہ شہر تو جرمن شہر فرینکفرٹ کی کاپی لگتا ہے۔ فلسطینی آبادی کو اس شہر سے بے دخل کرنے کے بعد جرمنی سے ہجرت کرنے والے یہودیوں نے اس کو ہو بہو اپنے آبائی شہر کی طرز پر ازسرِنو تعمیر کیا۔ جبل الکرمل جہاں حضرت الیاسؑ سے وابستہ غار ہے، کی ڈھلانوں پر بہائی فرقہ نے انتہائی خوبصورت باغ تعمیر کیا ہے، جو کشمیر کے شالامار اور نشاط کو شرمندہ کر دیتا ہے۔ اس پر انہوں نے ایک روحانی مرکز تعمیر کیا ہے۔

اسرائیل اور فلسطین کے مغربی کنارہ کو بس ایک دیوار ہی جدا کرتی ہے۔ مگر یہ دو علیحدہ براعظم لگتے ہیں۔ دیوار کی دوسری طرف فلسطینی بچے دھول مٹی سے کھیلتے ہوئے، پانی حاصل کرنے کے لیے قطاروں میں کھڑے اور سڑک پر گدھا گاڑیاں خراماں خراماں چلتی نظر آتی ہیں۔

مگر اسی دیوار کے اسرائیلی سائیڈ میں انتہائی پوش رہائش گاہیں، پارک اور جدید گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی نظر آتی ہیں۔

ظاہری بات ہے کہ اسرائیلی شہریوں کے اس اعلیٰ یورپین معیارِ زندگی کی ایک قیمت ہے۔ سوال ہے کہ یہ قیمت کون ادا کرتا ہے؟ کیونکہ اسرائیل کے اکثر شہری تو بھارتی اور پاکستان کی طرح مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں، جو زندگی کی گاڑی کو کھینچنے اور بچوں کے کیریئر کے فراق میں گھلتے رہتے ہیں۔

مالدار یورپی شہروں کی طرز پر عوامی خدمات بہم پہنچانے اور اعلیٰ معیارِ زندگی کے تحفظ کے لیے خاطر خواہ وسائل خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ یہ وسائل امریکی ٹیکس دہندگان کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ امریکی اداروں اور شہریوں میں اب اس پر سوال اٹھنا شروع ہو گئے ہیں کہ وہ کب تک اور کیوں اسرائیل کی ناز برداری کر کے اس کے شہریوں کے معیار زندگی کا خرچ اٹھائیں گے؟

امریکی کانگریس کی تحقیقاتی رپورٹوں کے مطابق ۱۹۴۶ء سے ۲۰۲۳ء تک امریکا نے اسرائیل کو ۲۹۷؍ارب ڈالر کی امداد دی ہے۔ کونسل فار فارن ریلیشن کے مطابق یہ امداد ۳۱۰؍ارب ڈالر سے تجاوز کر گئی ہے۔ اور اس میں ۲۳۰؍ارب ڈالر کی فوجی امداد ہے۔

اس کے مقابلے میں، مصر، جو امداد لینے کے معاملے میں دوسرے نمبر پر ہے، کو ۱۶۷؍ارب ڈالر موصول ہوئے ہیں، جبکہ فلسطین نے ۱۹۵۰ء سے اب تک صرف ۱۱؍ارب ڈالر وصول کیے ہیں۔ یہ بھی ذہن نشین ہو کہ مصر کی آبادی ۱۱؍کروڑ اور اسرائیل کی آبادی ۹۰ لاکھ ہے اور اس میں ۲۱ فیصد آبادی عرب مسلمانوں کی ہے، جن کو اسرائیلی عرب کہا جاتا ہے۔

پاکستان کو ۱۹۴۷ء سے ۷۰؍ارب ڈالر اور بھارت کو ۸۲؍ارب ڈالر کی امریکی امداد موصول ہوئی ہے۔

امریکی مالی امداد اسرائیل کے سالانہ بجٹ کا ۳ فیصد اور تقریباً ایک فیصد جی ڈی پی کا احاطہ کرتی ہے۔ کل دفاعی بجٹ کا ۲۰ فیصد حصہ امریکی امداد پر منحصر ہے۔

اسرائیلی اخبار ''ہارٹز'' کے مطابق یہ مالی امداد اس کے علاوہ ہے، جو امریکا اہم اور جدید ٹکنالوجی، جیسے آئرن ڈوم اور ایرو میزائل ڈیفنس سسٹم کی صورت میں فراہم کرتا ہے۔

مالی سال یعنی ۲۰۲۳ء اور ۲۰۲۴ء کے اوائل ماہ میں اسرائیل کو ہوشربا ۱۸؍ارب ڈالر کی امداد دی گئی، جس میں معیشت کی مضبوطی اور اضافی فوجی امداد شامل ہے۔ اس امدادی پیکیج میں میزائل اور میزائل دفاعی نظام کے لیے ۵ء۲ ارب ڈالر، جدید ہتھیاروں کے لیے ۵ء۳؍ارب ڈالر، ہتھیاروں کی پیداوار میں بہتری کے لیے ایک ارب ڈالر اور دیگر دفاعی ساز و سامان اور خدمات کے لیے ۴ء۴؍ارب ڈالر شامل ہیں۔

اس کے علاوہ غزہ میں جاری اسرائیلی کارروائی کے لیے ۴ء۲؍ارب ڈالر مختص رکھے گئے۔ اپریل میں، امریکی ایوان نمائندگان نے اسرائیل کے لیے ۱۷؍ارب ڈالر اور غزہ جنگ کے لیے تقریباً ۲؍ارب ڈالر فراہم کرنے کا ایک بل منظور کیا، جس میں ۸ء۳؍ارب ڈالر کی سالانہ امداد اور ۵ء۱۴؍ارب ڈالر کی اضافی امداد شامل ہے۔

دس سالہ معاہدے کے تحت، امریکا نے بنیادی طور پر فارن ملٹری فنانسنگ (ایف ایم ایف) پروگرام کے ذریعے ۲۰۲۸ء تک اسرائیل کو تقریباً ۴؍ارب ڈالر سالانہ کی امداد دینے کا وعدہ کیا ہے۔

جن دیگر ممالک کو اس طرح کی امداد دی جاتی ہے، ان کے لیے لازم ہے کہ وہ ان پیسوں سے صرف امریکی کمپنیوں کے بنائے گئے ساز و سامان کو ہی خریدیں۔ مگر اسرائیل کو یہ چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ اس امداد کا ایک بڑا حصہ اسرائیلی دفاعی کمپنیوں کے تیار کردہ آلات خریدنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

کسی بھی ملک کو امریکا کی طرف سے دی گئی فوجی امداد سخت امریکی قوانین کے ساتھ مشروط ہے جس کے لیے کانگریس کو اطلاع دینے اور ہتھیاروں کے اہم سودوں پر نظرثانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح امریکا نے اسرائیل کے خلاف لیہی قانون کو سختی سے لاگو نہیں کیا ہے، جو کہ غیر ملکی حکومتوں، جو انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کا ارتکاب کرتی ہیں، کو سیکورٹی امداد دینے سے منع کرتا ہے۔

اس امداد کے خلاف اب کئی مؤثر آوازیں میدان میں آ رہی ہیں۔ کونسل آن فارن ریلیشنز کے اسٹیون اے کک اور سابق امریکی سفیر مارٹن انڈیک کا کہنا ہے کہ اسرائیل کی معاشی اور عسکری طاقت کے پیش نظر اس طرح کی مسلسل مالی امداد کا جواز نہیں بنتا۔ امریکا میں اس بات پر بھی ناراضی بڑھ رہی ہے کہ اسرائیل سفارتی آداب کو پس پشت ڈال کر انتہائی بدتمیزی کے ساتھ امریکا کو چڑاتا ہے۔

اسرائیل کی ڈھٹائی کے خلاف اب امریکی محکمہ خارجہ کے اندر سے بھی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ جوش پال جو ۱۱؍سال سے زائد عرصے تک محکمہ خارجہ کے بیورو آف پولیٹیکو ملٹری افیئرز کے ڈائریکٹر رہے ہیں، کا کہنا ہے کہ دو سال قبل ایک چیریٹی گروپ کی رپورٹ ان کے محکمہ کے پاس آئی، جس میں یروشلم کی جیل میں بند ایک ۱۳؍سالہ فلسطینی لڑکے کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنانے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔

اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے جب اپنی سطح پر انکوائری کی تو اس الزام کو صحیح پایا۔ پال نے بطور ڈائریکٹر اسرائیل سے وضاحت طلب کی۔ وضاحت کیا آتی، اگلے دن اس چیریٹی گروپ کے تمام دفاتر پر اسرائیلی فوج نے ریڈ کی اور ان کے تمام کمپیوٹر و دفتری ریکارڈ ضبط کر کے اس کو ایک دہشت گرد گروپ کے طور پر نامزد کر کے اس پر پابندی لگا دی۔ اسرائیل کا یہ رویہ ایک ایسے ملک کے ساتھ ہے، جس کے بل بُوتے پر وہ قائم ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۵

'مصنوعی ذہانت' اور اُمڈتی تباہی

حسان احمد

کہتے ہیں کہ جنگل میں چڑیوں کا ایک اہم اجلاس ہوا، جس میں پورے جنگل کی چڑیاں شریک تھیں۔ ایک طرف کھانا پکانے کی ذمہ دار چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ سب کے لیے کھانا پکانے میں بہت محنت لگتی ہے۔ دوسری طرف چڑیوں کے ایک گروہ کا خیال تھا کہ اصل محنت تو ہماری ہوتی ہے کہ ہم دن بھر اپنی جان خطرے میں ڈال کر کھانے کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ اس دوران میں ایک چڑیا کو انوکھا خیال سوجھا۔ اس نے کہا کہ ہمارے پاس ایک اُلو ہونا چاہیے، جو ہمارے سارے کام کرے۔ ہمارے گھونسلے بنانے سے لے کر کھانا پکانے تک، بچوں کی تربیت سے لے کر ہماری حفاظت تک ساری ذمہ داریاں اسی اُلو کی ہوں گی، تو ہمیں کچھ کرنا نہیں پڑے گا اور یوں ہم زندگی کو صحیح معنوں میں بسر کر سکیں گے۔ یہ رائے سن کر ساری چڑیاں خوش ہوگئیں۔ سب نے اس رائے کی تائید کی سوائے ایک بزرگ چڑیا کے۔ اس بزرگ چڑیا کا کہنا تھا کہ ''اُلو کو لانے سے پہلے ہمیں اُلو کو قابو کرنا اور اپنا اطاعت گزار بنانا سیکھنا چاہیے۔ کہیں وہ اُلو ہماری سلطنت پر قبضہ کر کے خود ہمیں ہی اپنا غلام نہ بنا لے اور پھر کہیں یہ ہمارا اختتام ہی نہ بن جائے''۔

مگر اکثر چڑیوں کے خیال میں یہ ایک مشکل کام تھا، اس لیے زیادہ تر چڑیاں اُلو ڈھونڈنے نکل گئیں۔ اس بزرگ چڑیا کے ساتھ صرف دو چڑیاں رہ گئیں، جنھوں نے اُلو کو اپنا فرماں بردار بنانے کے طریقے سوچنے شروع کر دیے۔ مگر کچھ ہی دیر میں ان دو چڑیوں کو بھی یہ سمجھ آ گیا کہ یہ مشکل کام اُلو کی غیر موجودگی میں تو ناممکن ہے۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ جب اُلو آ جائے گا، تب ہی اس کو اطاعت گزار بنانے کا طریقہ بھی ڈھونڈ لیں گے۔

اس کہانی کا اختتام کیا ہوا؟ یہ کسی کو بھی نہیں پتہ۔ کچھ لوگوں کے خیال میں چڑیوں نے اُلو کے آنے کے بعد اس کو قابو کرنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا اور یوں ان کی ساری مشکلات آسان ہوگئی تھیں، اور کچھ لوگوں کے خیال میں اُلو کے آنے کے بعد چڑیاں اس کو قابو نہ کر سکیں اور اُلو نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر تمام چڑیوں کو اپنا غلام بنا لیا، یعنی کہانی کا اختتام سنانے والا کوئی بھی نہیں بچا۔

آج ٹیکنالوجی کے جس دور میں ہم جی رہے ہیں انسانیت کو بھی یہی سوال درپیش ہے۔ جہاں ہر بندہ کہہ رہا ہے کہ آنے والا دور 'مصنوعی ذہانت' (Artificial Intelligence-AI) کا ہوگا۔ بہت سارے لوگ اس کے خطرات کو نظرانداز کرنے کو ایک بھیانک غلطی کہہ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ انسانیت کی ترقی میں ایک اہم قدم ہے، تو کچھ اس قدم کو آخری انسانی غلطی بھی کہہ رہے ہیں۔

کیا ہم انسان واقعی 'مصنوعی ذہانت' کو اس کی معراج پر پہنچا سکیں گے، جہاں ہمارے سارے کام 'مصنوعی ذہانت' کے ذمے ہوں گے یا پھر اس کہانی کا اختتام بھی بالکل اسی طرح کسی کو کبھی معلوم نہ ہو سکے گا، جیسے ان چڑیوں کا انجام، کہ جو اُلو کو ڈھونڈنے اور اس کو سدھانے نکلی تھیں؟ یہ تو وقت ہی بتائے گا مگر 'مصنوعی ذہانت' کیا ہے اور اس کے انسانی زندگی اور مسلم معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اگلی سطور میں اس پر گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں:

'مصنوعی ذہانت' (AI) ہے کیا؟

یورپ میں نشاتِ ثانیہ کی بہت سی اہم بحثیں کائنات، انسان اور انسان کی اس دنیا میں موجودگی، زندگی اور اس کی وجوہ کے گرد گھومتی ہیں۔ جہاں بہت سے فلاسفر حضرات انسانی وجود کے بارے میں مختلف نظریات پیش کر رہے تھے، وہیں بہت سے ماہرین ریاضی اور سائنس دان اپنے مقالات کے ذریعے کائنات، زندگی اور مادہ سے متعلق مختلف رازوں سے پردہ اٹھانے کی کوششوں میں لگے تھے۔ فلسفہ، حساب اور سائنس کے اس ملاپ نے جدید دنیا کی تشکیل میں مدد تو کی مگر جلد ہی عملی سائنس، فلسفے پر حاوی ہوگئی۔ انسانیت نے فلسفے کی خیالی باتوں پر سائنس کی محیرالعقل ایجادات کو ترجیح دینا شروع کی، اور یوں مغرب سے مادیت کا ایک ایسا نیا طوفان اُٹھا، جس نے جلد پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طرح وہ ساری بحثیں جو کائنات کی حقیقت جاننے کے لیے شروع ہوئیں تھیں، جلد ہی کائنات کو فتح کرنے کی عملی کوششوں میں تبدیل ہوگئیں۔ انسان جس کا خود اپنا وجود ہی فلسفیوں کے لیے ایک سوال تھا، اب ایسی مشینیں بنانے میں لگ گیا، جو دنوں کا کام گھنٹوں میں انسان سے بہتر انداز میں کرنے لگ گئیں۔

پھر یہ سوال اٹھا کہ کیا ہم ایسی کوئی مشین بھی بنا سکتے ہیں، جو ہماری طرح سوچنا اور ہماری طرح کام کرنا شروع کر دے؟ ویسے تو بعض لوگوں کے نزدیک انسان کی یہ خواہش اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ کام نہ کرنے کی خواہش، مگر کمپیوٹر کی ایجاد نے انسان کا صدیوں پرانا یہ خواب دوبارہ جگا دیا۔

'مصنوعی ذہانت' (AI) ایسی مشینوں کی تیاری کو کہتے ہیں، جو وہ کام کر سکیں جن کو عام طور پر کرنے کے لیے انسانی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کو دیکھ کر یا اس کی آواز کو سن کر اس کو پہچان لینے کی صلاحیت، فیصلہ سازی کی صلاحیت، یا دو مختلف زبانوں میں ترجمے کی صلاحیت وغیرہ۔ ان مشینوں کو مخصوص موضوع پر مواد یا ڈیٹا دیا جاتا ہے اور اس مواد یا ڈیٹا میں مماثلت یا پیٹرن ڈھونڈ کر یہ مشینیں خود کو اس قابل بناتی ہیں کہ اگر ان کو اسی قسم کا مختلف مواد ملے تو وہ اس کو پہچان سکیں۔ مثلاً اگر ایک مشین کو بہت سارے مرد اور عورتوں کی تصاویر دکھائی جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ یہ ایک جوان ایشیائی مرد کی تصویر ہے، یا یہ ایک بوڑھی ہسپانوی خاتون کی تصویر ہے، تو وقت گزرنے کے ساتھ اور زیادہ سے زیادہ مختلف تصویروں کو پہچان کر یہ مشینیں اس قابل ہو جاتی ہیں کہ جب ان کو دوسری مگر مختلف تصاویر دکھائی جائیں تو وہ ان کو صحیح طور پر پہچان لیتی ہیں۔

اب آپ ان مشینوں کو جتنی زیادہ تصویروں کی پہچان کروائیں گے، یہ مشینیں اتنے ہی بہتر طریقے سے یہ فیصلہ کر سکیں گی کہ دکھائی جانے والی تصویر کسی نوجوان امریکی مرد کی ہے یا کسی افریقی خاتون کی؟ ان مشینوں کو مواد یا ڈیٹا کی فراہمی کا عمل 'مشین لرننگ' کہلاتا ہے اور نتیجے میں ہمیں ایک ایسا تربیت یافتہ ڈیٹا ماڈل ملتا ہے، جو ایک مخصوص کام کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک ڈیٹا ماڈل اگر انسانوں کو پہچان سکتا ہے تو دوسرا ماڈل جانوروں یا جگہوں کی پہچان کر سکتا ہے۔ آپ ایک زیادہ ذہین ڈیٹا ماڈل بھی بنا سکتے ہیں، جو انسانوں کے ساتھ ساتھ مختلف جانوروں اور چیزوں کو الگ الگ پہچان سکے۔ اسی طرح آپ ایک مشین کو مختلف زبانوں کی لغت یا ڈکشنری دے کر ایسا ڈیٹا ماڈل تیار کر سکتے ہیں جو دی گئی تحریر کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کر سکے۔

'مصنوعی ذہانت' کے اثرات

کمپیوٹر کی ایجاد نے جہاں 'مصنوعی ذہانت' کے لیے دروازے کھولے، وہیں انٹرنیٹ کی ترقی نے ڈیٹا ماڈلز کی تیاری کے کام کو بہت آسان کر دیا۔ اب کوئی بھی گھر بیٹھے ایسے ڈیٹا

ماڈلز تیار کرسکتا ہے جو کوئی بھی مخصوص کام نہایت ہی سرعت کے ساتھ سرانجام دے سکیں۔ کچھ لوگ اس ترقی کو 'صنعتی انقلاب' کی توسیع کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یعنی جس طرح صنعتی انقلاب نے خودکار مشینوں کو عام کردیا تھا اور وہ کام جو کئی انسان مل کر کئی دنوں میں کرتے تھے مشینوں نے کچھ گھنٹوں میں کرنے شروع کردیے تھے اسی طرح 'مصنوعی ذہانت' سے جدید ترین مشینیں وہ کام کرسکتی ہیں جو اَب تک مشینیں نہیں کرسکتی تھیں اور ان کے لیے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مثلاً معاشروں میں امن وامان اور نظم وضبط برقرار رکھنا اب تک سیکورٹی فورسز اور قانون نافذ کرنے والوں کی ذمہ داری رہی ہے۔ صنعتی ترقی کے بعد کسی بھی نظم ونسق کی بگڑتی صورتِ حال کو قابو کرنا پہلے کے مقابلے میں کافی آسان ہوگیا ہے۔ پہلے انسانوں کے ساتھ پہرے دینے کا کام کتے کرتے تھے، تو اب ان کی جگہ کیمروں نے لے لی ہے اور ہم اپنے دفتر میں بیٹھ کر اپنے گھر پر آنے والے کو دیکھ لیتے ہیں۔ مگر 'مصنوعی ذہانت' اس سب سے بھی آگے بڑھ کر کام کرتی ہے۔ مثلاً ایسے ڈیٹا ماڈلز بن گئے ہیں، جو حالات خراب ہونے سے پہلے ہی بتاسکتے ہیں کہ کس جگہ حالات خراب ہونے والے ہیں، یا کون، کب اور کہاں کسی جرم کا ارتکاب کرنے والا ہے؟

اسی طرح پہلے آپ کو اپنے کسی بینکنگ کے مسئلے کے حل کے لیے بینک جانا پڑتا تھا۔ پھر ٹکنالوجی کی ترقی نے یہ کام آسان کردیا اور ہم کال سینٹر پر فون کرکے اپنے مسائل حل کروانے لگے۔ لیکن جس کال سینٹر پر ہم کال کرکے اپنے بینک کے مسئلے کو حل کرتے ہیں، وہاں پر موجود افرادی قوت کی تربیت، تنخواہ اور دوسری چیزوں پر کافی پیسہ خرچ ہوتا تھا۔ پہلے تو اس کا حل یہ نکلا کہ امریکا اور یورپ میں مختلف کمپنیوں نے اپنے کال سینٹر بند کرکے ایسے ایشیائی ممالک میں کھول لیے جہاں سستی افرادی قوت موجود تھی۔ مگر اب 'مصنوعی ذہانت' نے یہ کام اور بھی زیادہ آسان کردیا ہے اور اب ایسے ڈیٹا ماڈل سے تربیت یافتہ 'چیٹ باٹس' آگئے ہیں جو انسانوں کی جگہ لے رہے ہیں۔ گویا پہلے اگر ایک شخص اپنے بینک کے کال سینٹر پر کال کرتا تھا تو اسے یہ پتا نہیں ہوتا تھا کہ اس کی کال کا جواب دنیا کے کس کونے سے ملے گا، تو اب اس کو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ اس کی کال کا جواب دینے والا کوئی انسان ہی ہے یا پھر کوئی مشین، جس کو اسی کام کے لیے تربیت دی گئی ہے۔

ورکنگ کلاس کا خاتمہ

بظاہر تو ایسا ہی نظر آتا ہے کہ یہ ترقی بالکل صنعتی ترقی کی ہی طرح ہے، یعنی کچھ ملازمتیں ختم ہوں گی تو کچھ نئی پیدا ہوجائیں گی۔ مگر یہ سب اتنا سادہ بھی نہیں۔ جب صنعتی انقلاب نے زندگی کے شعبہ جات میں ہنرمندوں کی ضرورت کم کردی، تو اس کا نتیجہ خاندانی منصوبہ بندی کی صورت میں نکلا اور حکومتی سطح پر آبادی کو کم کرنے کے پروگرام شروع کردیے گئے۔ کیونکہ جو وسائل انسانی بہبود پر لگ رہے تھے، اس سے کہیں زیادہ وسائل خودکار مشینوں کی تیاری میں لگنا شروع ہوگئے تھے۔ اس خاندانی منصوبہ بندی کے جو نتائج آج جاپان یا مختلف یورپی معاشرے دیکھ رہے ہیں وہ تو ایک بالکل علیحدہ موضوع ہے، لیکن چھوٹے خاندان اور سرمائے کی بہتات نے اسراف یا کنزیومرزم کے جس کلچر کو پھیلایا ہے، اس نے زمین پر موجود محدود وسائل کے ضیاع کو ایک بالکل نئی اور ہولناک سطح پر پہنچادیا ہے۔ لہٰذا بعض مفکرین زمین کو بیمار اور انسان کو اس بیماری کی وجہ قرار دے رہے ہیں۔

یہ مفکرین 'مصنوعی ذہانت' کو اس بیماری یعنی انسان کے خاتمے کے حل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ گویا جب 'مصنوعی ذہانت' انسانی ہنرمندوں کی ضرورت کو ختم کردے گی تو دنیا کے امیروں کے لیے ہنرمندوں یا ورکنگ کلاس کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ نتیجتاً زمین پر انسانی آبادی کو ڈرامائی انداز میں بہت کم کرکے زمین کا نظم ونسق چلانا باآسانی ممکن ہوجائے گا۔ کچھ سازشی نظریات کے پرچارک، کورونا لاک ڈاؤن اور پوری دنیا میں زبردستی ویکسینیشن کے عمل کو اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ، نشاتِ ثانیہ کے دور کی جو بحث انسان کے وجود کا سوال اُٹھا رہی تھی، وہ سائنس اور فلسفے کے اشتراک سے کائنات کو مسخر کرنے کی طرف چلی، تو اب خود انسانی وجود کے درپے نظر آرہی ہے۔

کیا جارج ارول کا ناول ۱۹۸۴ء حقیقت بن رہا ہے؟

چین میں 'مصنوعی ذہانت' کا جس طرح استعمال ہورہا ہے، اس سے خود یورپ پریشان نظر آرہا ہے۔ چین نے پچھلے عرصے میں 'مصنوعی ذہانت' کی مدد سے سوشل کریڈٹ سسٹم کے نام پر ایک ایسا ہمہ گیر نظام تشکیل دیا ہے، جو ہر چینی باشندے کی ہر حرکت کو نوٹ کرتا ہے اور پھر اس نظام کی بنیاد پر سزا وجزا کا فیصلہ کرتا ہے۔ مثلاً اگر آپ نے کوئی جرم نہ بھی کیا ہو، مگر آپ معاشرے کے لیے کوئی مثبت کام نہیں کررہے، تو یہ نظام آپ کو سزا دینے کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ اور کوئی کام تعمیری ہے یا تخریبی، اس کا فیصلہ ایک حکومتی کمیٹی کرتی ہے۔ اگر آپ نے کوئی چوری کی، یا کہیں کوئی غلط بیانی کی، یا پھر آپ نے آن لائن اسٹور سے بہت سارے کمپیوٹر گیمز خریدے ہیں، تو یقیناً آپ اپنا وقت غلط یا غیر تعمیری سرگرمیوں میں لگا رہے ہیں اور یہ نظام آپ کی تربیت کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

بظاہر آپ کو شاید یہ نظام معاشرے کی ترقی کے لیے بہت اچھا لگے، مگر یہ نظام اتنا ہولناک ہے کہ یورپ اور امریکا میں اس نظام کو جدید غلامی کی طرف ایک قدم قرار دیا گیا ہے۔ جہاں نجی زندگی، فیصلے کی آزادی اور آزادئ اظہار کا کوئی تصور نہ ہوگا۔ جہاں آپ نے کسی حکومتی فیصلے پر تنقید کی، وہاں آپ کا بینک اکاؤنٹ بند کردیا گیا۔

بعض ماہرین اسے جارج اُرول کے مشہور زمانہ ناول '۱۹۸۴' میں بیان کی گئی سوسائٹی سے تشبیہ دے رہے ہیں، جہاں ایک جابر حکومت پورے معاشرے کو کنٹرول کرتی نظر آتی ہے۔ ذرا اب تصور کریں کہ اگر خدا کے وجود سے انکاری خالص مادی معاشرے میں کام اور نماز پڑھنے کے اوقات ٹکرا جائیں، تو اس نظام کے بنانے والے نماز پڑھنا ایک غیر تعمیری سرگرمی قرار دے کر آپ کے کریڈٹ رینک کو کم کرسکتے ہیں۔ اور اگر آپ کا کریڈٹ شمار خطرے کی حد پار کرگیا تو یہ نظام آپ کی عقل ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ بعض رپورٹوں کے مطابق ایغور مسلمانوں کی نازی طرز کے انسانیت سوز کیمپوں میں تربیت اسی سلسلے کی ایک کڑی نظر آتی ہے۔

مگر چین ان سب باتوں کو مغرب کا پروپیگنڈا کہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ برطانیہ جو چین پر اس حوالے سے تنقید کرنے سے باز نہیں آتا، خود اپنے ہاں ایسا ہی نگرانی کا کڑا نظام نافذ کررہا ہے، جو 'مصنوعی ذہانت' کی انسانی چہروں کو پہچان لینے کی صلاحیت رکھنے والے کیمروں پر مشتمل ہے۔ پچھلے دنوں مشرقی لندن میں برطانوی پولیس نے ایک شہری کو محض اس لیے گرفتار کرلیا کیونکہ اس شخص نے ان چہروں کی نگرانی کرنے والے کیمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے اپنا چہرہ اپنے مفلر سے ڈھانپ لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنا چہرہ ڈھانپنا کوئی جرم نہیں اور میں کسی کو بھی اپنی حرکات کو ریکارڈ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، مگر پولیس نے اسے قبول نہیں کیا۔ بعد میں اس شخص کو جرمانہ کردیا گیا۔ نام نہاد آزاد برطانوی معاشرے میں پولیس کے اس اقدام پر کڑی تنقید کی جارہی ہے، مگر برطانوی پولیس کے نزدیک یہ شہریوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔

اسمارٹ فونز یا جاسوسی کے آلات؟

اکثر ماہرین اسمارٹ فونز کو جاسوسی کے آلات سے تشبیہ

دیتے ہیں، کیونکہ جب آپ اپنا اسمارٹ فون استعمال نہیں بھی کررہے ہوتے تب بھی یہ آپ کی باتیں سن رہا ہوتا ہے اور اس کو آپ کی تمام حرکات کا ادراک ہوتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ آپ ایک پرانے واقف کار سے بات کرنے کھڑے ہوتے ہیں اور کچھ ہی دیر میں فیس بک آپ کو اس بندے کو فیس بک پر اپنی فرینڈلسٹ میں شامل کرنے کا مشورہ دے دیتا ہے، یا اکثر وہ چیز جس کے بارے میں آپ صرف سوچ ہی رہے ہوتے ہیں، وہ آپ کی 'سرچ' میں آنا شروع ہوجاتی ہے۔ یہ سب آپ کے اسمارٹ فون میں موجود مختلف ایپلی کیشنز کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے، جو یہ سب ریکارڈ کرکے کسی ڈیٹا سینٹر کو بھیجتی ہیں، اور وہاں 'مصنوعی ذہانت' اس ڈیٹا کو استعمال کرتے ہوئے آپ کو مختلف چیزیں دکھا رہی ہوتی ہے۔

غزہ جنگ میں اسرائیل کا 'مصنوعی ذہانت' کا استعمال

'مصنوعی ذہانت' آنے والے دنوں میں جنگوں کو کس طرح تبدیل کردے گی؟ اس کا اندازہ بی بی سی کی اس خبر سے ہوتا ہے، جس کے مطابق اسرائیل نے 'مصنوعی ذہانت' کے ذریعے لاکھوں فلسطینیوں کی جاسوسی کرتے ہوئے تقریباً ۳۷ ہزار فلسطینیوں کو حماس کا جنگجو قرار دے کر حالیہ جنگ میں خصوصی طور پر اپنے نشانے پر رکھا۔ تفصیلات کے مطابق اسرائیل کا 'مصنوعی ذہانت' کا پروگرام، جسے لاوینڈر (Lavender) کا نام دیا گیا ہے، فلسطینیوں کے موبائل فونز اور دیگر حرکات وسکنات کی جاسوسی کرنے کے بعد ان کی ایک سے ۱۰۰ کی حد کے درمیان درجہ بندی کرتا ہے اور کسی فلسطینی کا حماس سے کتنا گہرا تعلق ہے؟ اس کی نشاندہی کرتا ہے۔

مثلاً ایک فرد جو ایک ایسے 'وٹس ایپ' گروپ میں تھا، جہاں ایک حماس کا مجاہد بھی شامل تھا یا پھر دونوں نے ایک مسجد میں نماز پڑھ لی، یا اگر ایک فرد اپنا سیل فون بار بار تبدیل کررہا تھا، یا اگر عام فلسطینی کا موبائل فون اسی علاقے میں پایا گیا، جہاں ایک حماس کا جنگجو بھی موجود تھا، تو ایسے افراد کو اسرائیلی 'مصنوعی ذہانت' کے پروگرام نے خود بخود حماس کا ہمدرد یا جنگجو قرار دے دیا۔ خود اسرائیلی ماہرین کے مطابق اس پروگرام میں کم از کم ۱۰ فیصد غلطی کا امکان موجود ہے، مگر حالیہ جنگ میں اسرائیلی فوج کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ ''نہ صرف ایسے لوگوں کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے بلکہ ان پر ہر حملے کے دوران اگر ۲۰ کے قریب دوسرے عام افراد بھی مارے جائیں تو کوئی پروا نہیں''۔

پھر 'مصنوعی ذہانت' کا یہ پروگرام ان افراد کی حرکات و سکنات پر مستقل نظر رکھتا۔ جیسے ہی وہ اپنے گھروں میں داخل ہوتے، یہ پروگرام اسرائیلی فوج کو ایک خصوصی پیغام بھیج دیتا ہے۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں ایسے بہت سارے افراد کے گھروں پر میزائل حملے کیے گئے، جب 'مصنوعی ذہانت' کے اس پروگرام نے گھروں میں ان کی موجودگی ظاہر کی۔ جس کے نتیجے میں بے شمار عام افراد، جن کا حماس سے کوئی تعلق بھی نہ تھا، مارے گئے۔ اس پورے عمل میں اسرائیلی فوجی اپنے دفاتر میں بیٹھے یہ کارروائیاں کرتے رہے اور ان کو اپنی جان خطرے میں ڈالنے یا زمینی حملے کی ضرورت نہیں پڑی۔

مشینوں سے 'دل لگی' کا انجام؟

'مصنوعی ذہانت' کا استعمال ہماری روزمرہ کی زندگیوں کو کس طرح تبدیل کردے گا اور ہمارا ایک دوسرے سے میل ملاپ کس طرح بدل جائے گا؟ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ گذشتہ دنوں ایک مشہور ماڈل کا انسٹاگرام اکاؤنٹ 'ہیک' کرلیا گیا، جو اپنی روزمرہ کی تصاویر اپنے انسٹاگرام پر ڈالتی تھی۔ اکاؤنٹ 'ہیک' کرنے والے نے اس ماڈل سے مطالبہ کیا کہ جب تک وہ ماڈل دنیا کو اپنی حقیقت نہیں بتائے گی اس وقت تک اس کو اس کا اکاونٹ واپس نہیں ملے گا۔ انسٹاگرام پر ایک ملین سے زائد رابطے رکھنے والی اس ماڈل نے بالآخر یہ تسلیم کرلیا کہ وہ کوئی حقیقی انسان نہیں بلکہ مصنوعی ذہانت کے ذریعے بنایا گیا ایک روبوٹ ہے اور اس کا اکاؤنٹ جس نے 'ہیک' کیا ہے، وہ بھی کوئی انسان نہیں بلکہ ایک دوسرا روبوٹ ہے۔

دنیا کے سامنے جب یہ حقیقت آئی تو اس ماڈل کے لاکھوں فالورز حیران و پریشان رہ گئے کہ کس طرح حقیقت سے قریب اس کی تصاویر دیکھ کر نہ صرف وہ اس سے مرعوب تھے بلکہ بعض تو اس کی جیسی زندگی گزارنے کے خواہش مند بھی تھے۔ کچھ حضرات تو اس سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے سے بھی باز نہ آئے تھے اور اس یک طرفہ پیار کا یہ ڈراپ سین ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ آپ نے ایسے کئی قصے سنے ہوں گے کہ کس طرح کسی لڑکے نے لڑکی بن کر دوسرے لڑکے کو بے وقوف بنایا، مگر سوشل روبوٹس کے ذریعے یہ کام اب مشینیں کررہی ہیں۔

ٹیکنالوجی کے جریدے Wired کی ایک تحقیق کے مطابق اس وقت کروڑوں سوشل میڈیا سائٹس ایکٹو ہیں، جو 'مصنوعی ذہانت' کے استعمال سے کہیں کسی برانڈ کی مارکیٹنگ میں مصروف ہیں تو کہیں آپ کا کریڈٹ کارڈ چوری کرنے کے درپے۔

کیا آپ نے اپنا آخری ووٹ شعوری طور پر دیا تھا؟

سوشل میڈیا پر روبوٹس کے ذریعے اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانا اور مخالفین کو دیوار سے لگانا اب کتنا عام ہوگیا ہے، اس کا ایک مظاہرہ دو سال قبل پورے پاکستان نے دیکھا۔ تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کو جب عدم اعتماد کے ذریعے وزارت عظمیٰ سے فارغ کیا گیا تو ان کے چاہنے والوں نے سوشل میڈیا پر ایک طوفان برپا کردیا۔ عدم اعتماد کی تحریک کی منظوری کے چند ہی گھنٹوں میں ٹویٹر، جس کا موجودہ نام ایکس ہے، پر کئی کئی ملین لوگوں نے مذمتی ٹویٹ کرنا شروع کردیے۔ امپورٹڈ حکومت نامنظور، میر جعفر اور میر صادق نامنظور جیسے بے شمار ٹرینڈز چھا گئے۔

روس کے زیر اثر مشرقی یورپ کے چند ممالک میں بیٹھے چند سرپھروں پر روسی مدد کے ذریعے امریکا اور مختلف یورپی ممالک کے انتخابات میں سوشل میڈیا کے ذریعے مداخلت کا الزام بار بار لگا ہے۔ مگر خود امریکا میں کس طرح سوشل میڈیا سے حاصل ہونے والے مواد یا ڈیٹا کو 'مصنوعی ذہانت' کے ساتھ ملا کر ووٹرز کی نفسیات سے کھیلنے کے لیے استعمال کیا گیا؟ اس کا انکشاف اس وقت ہوا، جب ۲۰۱۸ء میں کیمرج انالیٹکا اسکینڈل سامنے آیا۔ کیمرج انالیٹکا ایک 'مصنوعی ذہانت' پر مبنی سافٹ ویئر بنانے والی کمپنی تھی جس نے فیس بک پر موجود امریکی ووٹرز کا ڈیٹا اکٹھا کرنا شروع کیا اور پھر ان ووٹرز کی پسند ناپسند اور سیاسی ترجیحات کا ایک مفصل ڈیٹا بیس بنایا، جو یہ بتا سکتا تھا کہ امریکا کی ریاست الاسکا میں موجود ایک چالیس سالہ سیاہ فام شخص کس کو ووٹ دے گا اور واشنگٹن میں موجود ایک پرائمری اسکول ٹیچر کیا سوچ کر ووٹ دے گا؟

کروڑوں امریکیوں کی تفصیلات پر مشتمل اس ڈیٹا بیس کو سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے حمایتیوں نے خرید کر اپنے حق میں استعمال کرنا شروع کردیا۔ اور ہر ووٹر کو اس کی ذاتی پسند ناپسند اور سیاسی ترجیحات کے مطابق پیغامات دکھا کر ایک طرف تو ڈونلڈ ٹرمپ کو ووٹ دینے کے لیے آمادہ کیا، تو دوسری طرف مخالف سیاسی رہنماؤں کے حمایتیوں کو ان کے پسندیدہ رہنما کی ناکامیوں پر مبنی پروپیگنڈا دکھا کر بدظن کیا گیا، تاکہ اگر وہ ڈونلڈ ٹرمپ کو ووٹ نہ دیں تو کم از کم ٹرمپ مخالف اُمیدوار کو بھی ووٹ نہ دیں اور اس طرح ڈونلڈ ٹرمپ یہ الیکشن جیتنے میں کامیاب ہوگئے۔

اس لیے اگر آپ سوشل میڈیا استعمال کرتے ہیں اور آپ کو لگتا ہے کہ آخری الیکشن میں آپ نے اپنا ووٹ شعوری

طور پر دیا تھا اور آپ کسی پروپیگنڈا کا شکار نہیں ہوئے تھے، تو آپ کو حالات کی سنگینی کا اندازہ بالکل نہیں۔ ایک تجزیہ کے مطابق یہ سوشل میڈیا کمپنیاں آپ کے بارے میں خود آپ سے زیادہ جانتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آن لائن اسٹور پر جو آخری چیز آپ نے خریدی ہے اس کی آپ کو ضرورت ہی نہ ہو مگر آپ نے ایک انجان پروپیگنڈا کا شکار ہوکر وہ چیز خرید لی، اور یہ سب 'مصنوعی ذہانت' کے استعمال سے ممکن ہوا ہے۔

'مصنوعی ذہانت' کے استعمال پر برتری کی جنگ

بیسویں صدی کے نصف میں ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی جنگ تو آپ کو یاد ہوگی۔ صرف امریکا اور روس ہی نہیں بلکہ تمام چھوٹے بڑے ممالک یا تو ایٹمی ہتھیار تیار کرنے کی دوڑ میں لگے تھے کہ ہر ایک کے نزدیک یہ ان کی بقا کے لیے ضروری تھا۔ 'مصنوعی ذہانت' کے ماہرین کے خیال میں کچھ ایسی ہی صورتِ حال اکیسویں صدی میں بھی پیش آنے والی ہے۔ اس بار یہ صورتِ حال 'مصنوعی ذہانت' کے استعمال پر کسی بھی دوسرے ملک یا گروہ سے زیادہ مہارت حاصل کرنے کی ہوگی۔ اور برتری حاصل کرنے کی یہ جنگ زیادہ خطرناک ہوگی کیونکہ 'مصنوعی ذہانت' زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرے گی۔ آپ صرف کوئی چیز ہی 'مصنوعی ذہانت' کی وجہ سے نہیں خرید رہے ہوں گے بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی یہ آپ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوگی۔

یہ معاملہ صرف تجارت کے میدان تک محدود نہیں بلکہ اگلی ہونے والی جنگوں میں وہی فاتح ہوگا جو 'مصنوعی ذہانت' کا زیادہ بہتر استعمال کرے گا۔ جنگوں میں صحیح اور بروقت فیصلے ہی آپ کی فتح کا باعث بنتے ہیں۔ چین اور امریکا ایسے ہتھیاروں کی دوڑ میں لگ گئے ہیں، جو 'مصنوعی ذہانت' کی مدد سے آنے والی معلومات کو نہ صرف انسانوں سے زیادہ جلدی قابلِ استعمال بنا سکیں گے بلکہ انسانوں سے زیادہ جلدی اور شاید انسانوں سے بہتر فیصلے کرکے دشمن کو زیر کرلیں گے۔

دوسری طرف زراعت کے ماہرین 'مصنوعی ذہانت' سے لیس ایسے ڈرون استعمال کررہے ہیں، جو فصل پر موجود کسی آنے والی بیماری کا پہلے ہی اندازہ لگا کر پیشگی اقدام کے ذریعے بہتر پیداوار لے رہے ہیں۔ کہیں اساتذہ کی کمی کا حل 'مصنوعی ذہانت' کے حامل روبوٹ اساتذہ کی صورت میں نکالا جارہا ہے۔ پھر ملٹی نیشنل کمپنیاں مختلف بیماریوں کا علاج 'مصنوعی ذہانت' کے ذریعے جلد از جلد حاصل کرکے اپنی دوائیاں مارکیٹ میں دوسروں سے پہلے لاکر زیادہ منافع کمانے کی دوڑ میں لگ گئی ہیں۔

آج 'مصنوعی ذہانت' کے گرد گھومنے والی تحقیق، ڈیٹا ماڈلز اور معلومات کی نہ صرف حفاظت کی جارہی ہے بلکہ دشمن ملکوں کی اس میدان میں ہونے والی تحقیق کو حاصل کرنے کے لیے جاسوسوں کی مدد بھی حاصل کی جارہی ہے۔ ایک خبر کے مطابق انٹرنیٹ سرچ انجن کمپنی گوگل نے اپنے ایک چینی نژاد ملازم کو 'مصنوعی ذہانت' سے متعلق انتہائی خفیہ معلومات چین کو دینے کے الزام میں ملازمت سے برطرف کردیا اور اب اس کو گرفتار کرکے مقدمہ چلانے کی تیاری ہورہی ہے۔

'مصنوعی ذہانت' اور اخلاقیات کا سوال

'مصنوعی ذہانت' کے بڑھتے ہوئے استعمال کے ساتھ ہی اس کے اخلاقی پہلوؤں پر بھی سوالات اٹھنا شروع ہوگئے ہیں۔ منفی ذہن رکھنے والے نوجوان 'مصنوعی ذہانت' کے منفی استعمال سے باز نہیں آرہے۔ انھوں نے ایسی ویب سائٹس بنالی ہیں، جہاں آپ کسی بھی خاتون کی تصویر ڈالیں اور وہ ویب سائٹ نتیجے کے طور پر اس خاتون کی جعلی مگر حقیقت سے بہت قریب برہنہ تصاویر شائع کردیتی ہے۔ اس عمل کو ڈیپ فیک ٹکنالوجی کے استعمال سے ممکن بنایا جاتا ہے۔ اس عمل سے متاثرہ خاتون اور اس کے قریبی لوگوں پر کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

رائٹرز نیوز ایجنسی کی خبر کے مطابق ایلون مسک کی اے آئی کمپنی نے ایسی کمپیوٹر چپ بنالی ہے جو انسانی دماغ کو پڑھ کر کام سرانجام دیتی ہے۔ اسے نیورولنک کا نام دیا گیا ہے۔ فی الحال تو ایک طبقہ اسے جسمانی طور پر مفلوج لوگوں کے لیے بہت کارآمد قرار دے رہا ہے۔ مگر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ کہیں کوئی دوسرا فرد ایسی کسی چپ کو ہیک کرکے کوئی ایسا غلط کام کرلے جو اس مفلوج شخص کی خواہش نہیں تھا مگر اس غلط کام کی سزا اس کو مل سکتی ہے کیونکہ جس چپ نے یہ کام کیا وہ اس کے دماغ کے ساتھ منسلک تھی۔

'مصنوعی ذہانت' کے ماہرین نے ایسی کسی ایپ کی اخلاقی حیثیت پر کافی سوالات اٹھائے ہیں اور ان کے خیال میں بڑھتا ہوا 'مصنوعی ذہانت' کا استعمال آنے والے دنوں میں ایسے بہت سے خطرات پیدا کردے گا۔ مثال کے طور پر انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کے زوال، 'مصنوعی ذہانت' کی مدد سے دہشت گردی، بڑھتی ہوئی ہیکنگ کا اندیشہ۔

'مصنوعی عام ذہانت' کا حصول

'مصنوعی ذہانت' کے ماہرین اب ایسی مشینوں پر کام کررہے ہیں، جو ہم انسانوں کی طرح سوچ سکیں اور جس طرح ہم کام کرتے اور زندگی بسر کرتے ہیں اسی طرح وہ مشینیں بھی کرسکیں۔ اس انسانی درجے کی ذہانت کو 'مصنوعی عام ذہانت' یا آرٹیفیشل جنرل انٹیلی جنس کہا جاتا ہے، یعنی ایسی 'مصنوعی ذہانت' کی حامل مشینیں جو بالکل انسانوں کی طرح مختلف امور سرانجام دے سکیں۔

کچھ ماہرین کے نزدیک تو ایسی کسی ذہانت کا حصول ممکن نہیں مگر بعض ماہرین زیادہ محتاط رہنے کا مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ اس ضمن میں قانون سازی اور بین الاقوامی معاہدوں کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے ایسی مشینیں بنالیں جو انسانوں جیسی ذہانت رکھتی ہوں تو پھر کیا ضمانت ہوگی کہ وہ مشینیں ہم سے زیادہ ذہانت کا حصول نہ کرلیں، اور پھر مشینوں اور انسانوں میں زمین پر قبضے کی ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہوجائے؟ مشہور فلم ٹرمینیٹر اسی نظریے کے گرد گھومتی ہے۔

وال اسٹریٹ جنرل کی ایک خبر کے مطابق اوپن اے آئی کے سربراہ سام الٹ مین اپنے ایک نئے منصوبے کے لیے آج کل دنیا بھر کے امیروں سے سات ٹریلین ڈالرز اکٹھا کرنے کی مہم پر ہیں۔ یاد رہے کہ دوسو برسوں میں دنیا کے ہر خطے میں جنگ کرنے اور بے تحاشا ڈالر چھاپنے کے باوجود امریکا کا کل قرضہ ۳۲ ٹریلین ڈالر کا ہے۔ یعنی یہ خفیہ منصوبہ کل امریکی قرضے کے ایک تہائی رقم کے برابر ہے۔

آخر سام الٹ مین کو اتنی خطیر رقم کس منصوبے کے لیے درکار ہے؟ اس کے بارے میں تو کوئی نہیں جانتا مگر ۲۰۲۳ء کے آخر میں سام الٹ مین کو اوپن اے آئی کمپنی کے بورڈ نے نوکری سے برطرف کردیا تھا۔ یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ اسے برطرف کیوں کردیا گیا تھا، مگر اس کی وجہ وہ انٹرویو تھا جو چند دن قبل سام الٹ مین نے دیا تھا، جس میں انھوں نے اپنی کمپنی کی 'مصنوعی ذہانت' کے میدان میں ایک ایسی ایجاد کے بارے میں گفتگو کی تھی، جس کو وہ مشین کہنے کو تیار نہیں تھے۔ رائٹرز کی ایک خبر کے مطابق اوپن اے آئی کمپنی میں کام کرنے والے کچھ سینئر ماہرین نے ایک خط کے ذریعے کمپنی کو خبردار کیا تھا کہ کمپنی کی نئی ایجاد انسانیت کے لیے شدید خطرہ بن سکتی ہے۔

کئی مہینے گزرنے کے بعد اب تک نہ تو اس خط کے مندرجات پر کوئی بات سامنے آئی ہے اور نہ سام الٹ مین کی اچانک برطرفی اور مائکروسافٹ کے سربراہ کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سامنے آئی ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں سام الٹ مین

کا ۷ ٹریلین ڈالرز کا منصوبہ اور اس نئی اور خفیہ ایجاد کا تعلق 'مصنوعی عام ذہانت' یعنی آرٹیفیشل جنرل انٹیلی جنس سے ہے، جو کچھ ماہرین کی نظر میں خود انسانیت کا خاتمہ کرسکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سام الٹ مین اس خطرے سے متفق نظر آتے ہیں کہ 'مصنوعی عام ذہانت' انسان کا خاتمہ کردے گی، مگر انھیں ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ اس سے قبل انسان 'مصنوعی ذہانت' سے بہت سی دلچسپ کامیابیاں حاصل کرے گا۔

سوال یہ ہے کہ کیا 'مصنوعی ذہانت' نیورولنک، جینیٹکس انجینئرنگ اور ایسی بہت سی جدید ایجادات سے ملا کر کسی انسان نما ڈیجیٹل مخلوق کی تخلیق کرسکنے کے قابل ہوگئی ہے؟ کیا ٹرانس ہیومنزم کے نظریات سچ ثابت ہونے والے ہیں؟

سپر انٹیلی جنس اور خدائی عقل تک پہنچنے کی خواہش

'مصنوعی ذہانت' انسانوں کو اپنا غلام بنالے گی یا انسانوں کا خاتمہ کردے گی؟ اس بحث کا نتیجہ نکالنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا چڑیوں کے لیے اُلو کو سدھانا۔ مگر نشاتِ ثانیہ کے دور میں جب انسان نے خدا کا انکار کردیا تو اس نے عقل کو خدا بنالیا۔ ڈیکارٹ کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا کہ ''میں ہوں کیونکہ میں سوچتا ہوں''۔ اور یوں انسان اشرف المخلوقات کے منصب سے گر کر محض ایک 'سوچنے والا جانور' قرار پایا۔

اس سوچ نے مادی ترقی کے نت نئے دروازے تو کھول دیے، مگر جلد ہی مغرب پر یہ بات آشکار ہوگئی کہ عقل محدود ہے۔ بیسویں صدی میں جب سائنسی ایجادات کی رفتار تقریباً رُک گئی، تو انسان کو ایک بار پھر اپنی بیچارگی کا غم ستانے لگا۔ مگر کمپیوٹنگ اور کمپیوٹر کے استعمال کی بڑھتی ہوئی طاقت اور 'مصنوعی ذہانت' کے میدان میں ملنے والی کامیابیوں نے اس کی امیدیں دوبارہ ہری کردی ہیں۔ بہت سے ماہرین ایسی 'مصنوعی ذہانت' کے حصول کی بات کررہے ہیں، جو ذہین سے ذہین انسان سے بھی زیادہ ذہین ہوگی اور اسے سپر انٹیلی جنس کہا جاتا ہے۔

اس کہانی کا انجام کیا ہوگا؟

طوفانوں اور انقلابات میں کئی چیزیں مشترک ہوتی ہیں، مثلاً دونوں ہی پوری زمین پر ایک ساتھ نہیں بلکہ زمین کے کسی مخصوص خطے اور کسی مخصوص معاشرے میں تبدیلی اور تباہی لاتے ہیں۔ معلوم انسانی زندگی میں صرف ایک ہی طوفان ایسا تھا، جس نے پوری زمین کو ایک ساتھ لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ طوفان نوحؑ تھا۔ مگر اب انسانیت کو ایک ایسے ہی طوفان یا انقلاب کا سامنا ہے جو بیک وقت پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ 'مصنوعی ذہانت' کا یہ طوفان ذہنوں کو ماؤف، زبانوں کو گنگ اور ہاتھ پاؤں شل کردے گا۔

اُمت مسلمہ جسے نائن الیون کے بعد اپنی بقا کا مسئلہ درپیش ہے، اس معاملے میں بالکل مفلوج نظر آتی ہے۔ صرف عمل کی طاقت ہی نہیں بلکہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم اُمت مسلمہ کے لیے یہ طوفان بالکل اسی طرح زندگی اور موت کا سوال بن کر کھڑا ہوجائے گا، جیسے عقل کی محدودیت کا اقرار کرنے کے بعد جب مغرب نے اسلام کو مستقبل کے طور پر دیکھنا شروع کیا اور بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی میں اسلام یورپ کا سب سے بڑا مذہب نظر آنے لگا، تو ایک طرف اسلام کو 'دہشت گردی' کے ساتھ جوڑ کر مادیت سے مغلوب مغرب کو اسلام سے بدظن کیا گیا۔

اس ضمن میں ہم بحیثیت مسلمان کم از کم اتنا ضرور کرسکتے ہیں کہ 'مصنوعی ذہانت' کے طوفان کو محض سطحی دائرے میں دیکھنے کے بجائے اس کی حقیقت کو سمجھیں اور پھر کوئی لائحہ عمل طے کریں۔ 'مصنوعی ذہانت' اور کوانٹم کمپیوٹرز کی پراسسنگ طاقت ایک ساتھ مل کر کیا کچھ نئے گل کھلائے گی؟ اس کا آج سوچنا بھی محال ہے۔ جدید مغرب کو سمجھنے کے لیے فلسفہ اور سائنس کو ایک ساتھ لے کر سمجھنا ہوگا اور شاید جدید تاریخ میں پہلی بار عملی سائنس 'مصنوعی ذہانت' کی مدد سے ایک نیا فلسفہ، ایک نیا مذہب اور ایک نیا خدا تخلیق کرنے کی آخری کوشش کرے گی۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' لاہور۔ مئی ۲۰۲۴ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتب... برائے رابطہ: اکیڈمی بک سینٹر۔ فون 021-36349840

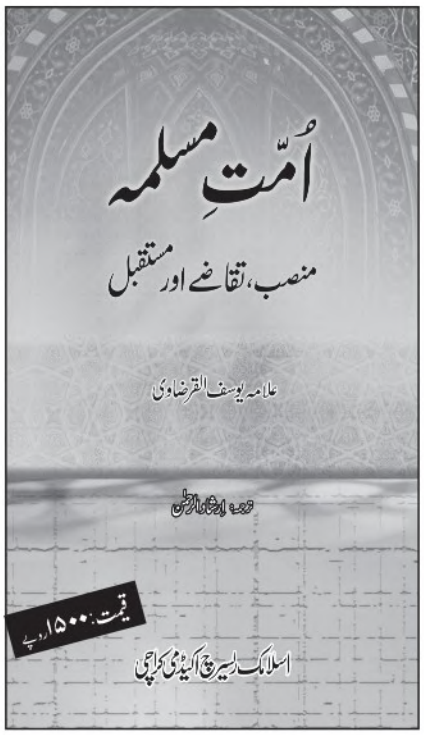

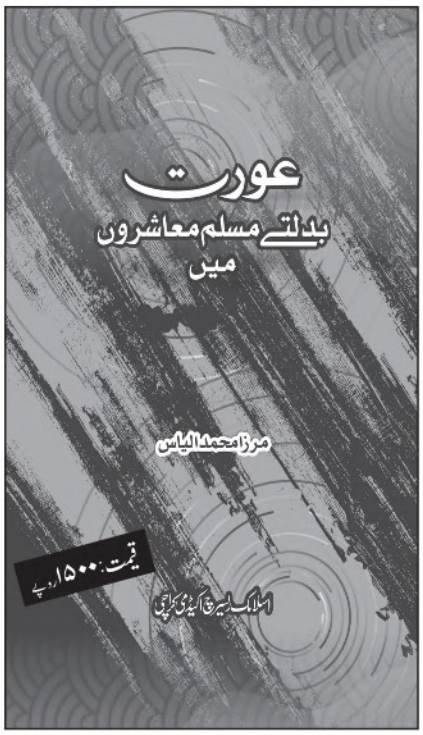

بقیہ: اسلاموفوبیا اور بھارت کی موجودہ صورتحال

بھارت میں روایتی طور پر فرقہ پرستی رہی ہے۔ اسلاموفوبیا یا زینوفوبیا نہیں رہا۔ یہ اصلاً یوروپی ردعمل ہے جسے بھارت میں درآمد کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

چونکہ بھارت میں مسلمان اجنبی نہیں ہیں اس لیے اسلاموفوبیا پیدا کرنے کے لیے ان کو مصنوعی طور پر اجنبی بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اجنبی بنانے کے لیے مکانی حاشیہ سازی (spatial marginalisation)، ادارہ جاتی دوری اور ذہنی دوری، تینوں طرح کی دوریاں پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ صورت حال اسی طرح جاری رہی تو اگلی نسلوں کے غیر مسلموں کے لیے مسلمان ویسے ہی اجنبی بن جائیں گے جیسے یوروپی ممالک میں مہاجرین ہیں۔

ملک میں مسلمانوں سے ذہنی دوری پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کے غلط بیانیے عام کیے جارہے ہیں۔

مسلمانوں کے ردعمل میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس مسئلے کی جڑ اور مسلمانوں کی حیثیت کو صحیح سے سمجھ کر جوابی حکمت عملی کا تعین نہیں کیا جارہا ہے۔ مسلمان محض نسل نہیں ہیں اس لیے شناخت کی سیاست اس مسئلے کا حل نہیں ہوسکتی، یہ مسئلہ محض سیاسی نہیں ہے اس لیے صرف سیاسی قوت اس کو حل نہیں کرسکتی اور یہ صرف چند وقتی غلط فہمیوں کا نتیجہ نہیں ہے اس لیے صرف میل ملاپ اور خیر سگالی کے ذریعے اسے حل کرلینا خام خیالی ہے۔

مسئلے کا حل دو کاموں پر مشتمل ہے۔ ایک اجنبیت اور دوری کو ختم کرنا اور دوسرا اسلام کے اصولوں اور مسلمانوں کے وجود کے سلسلے میں پیدا کردہ توحش کو دور کرنا اور اس اضطراب کو ختم کرنا جو 'ناقصیت کے اضطراب (Anxiety of Incompleteness) کے نتیجے میں پیدا ہورہا ہے۔

اسلاموفوبیا کے مسئلے کی طرف قرآن مجید واضح اشارہ بھی کرتا ہے اور اس کا حل بھی بتاتا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

''مسلمانو! تمھیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے''۔ (آل عمران:۱۸۶) اس آیت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کے مخالفین کی جانب سے تکلیف دہ بیانیوں کی تکرار، کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے بلکہ اہل ایمان کی آزمائش کا حصہ ہے اور دوسری اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان حالات میں اللہ کی ہدایت اور اس مسئلے کا قرآنی حل یہ ہے کہ ہم تقویٰ اور صبر کی روش اختیار کریں۔ صبر کا مطلب بزدلی یا فرار نہیں ہے بلکہ جذبات پر عقل اور دین کا کنٹرول ہو، یہ صبر ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی کا ہر عمل عقل وشعور اور قرآن سے ماخوذ فہم و حکمت سے طے پائے، اسے اپنے آپ پر پورا کنٹرول حاصل ہو اور اس کا کوئی قدم بھی شعوری فیصلے کے بغیر نہ اٹھے۔ تقویٰ یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل خدا کے دین کی تعلیمات اور اپنے مقام ومنصب کے شعور کے ساتھ ہو۔ اسی میں کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

اسلاموفوبیا کا حل تلاش کرتے ہوئے یہی دو اصول اصلاً ہمارے پیش نظر ہونے چاہئیں۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''زندگی نو''، نئی دہلی۔ جون ۲۰۲۴ء)

بقیہ: مغربی یونیورسٹیاں اور اسرائیلائزیشن کے خلاف مزاحمت

اکادمی بائیکاٹ نہ صرف اسرائیلی اعلیٰ تعلیمی اداروں اور اسرائیلی معاشرے پر دباؤ ڈالنے کا ایک ضروری قدم نہیں، بلکہ یہ خود مغربی یونیورسٹیوں کی اسرائیلائزیشن کے خلاف مزاحمت اور اس خوش فہمی کو چیلنج کرنے کا بھی ایک موقع ہے کہ تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھنا ہمیشہ اوّلین ترجیح ہوتی ہے۔ لیکن جب بھوک، بیماری، بے سروسامانی اور گرتے ہوئے بموں کی دہشت غزہ کے باشندوں کو اپنے مرنے والوں کا سوگ منانے تک سے بھی روک رہی ہو، تو ایسے میں علمی تجزیے کو ترجیح دینا بہت معیوب ہے۔ یہ کام اور بھی زیادہ معیوب ہے کہ جب زیر بحث تعلیمی سرگرمی اسرائیلی یونیورسٹیوں کی سرپرستی میں یا ان کے ساتھ مشترکہ طور پر کی جارہی ہو۔

اگر اور کچھ نہیں تو، اکادمی بائیکاٹ کی قانونی شرائط کے مطابق، اسرائیلی اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ساتھ تعلقات کی معطلی اس دکھاوے کو چیلنج کرنے کا ایک طریقہ ہے کہ دنیا کی غلطیاں سرکاری طور پر منظور شدہ کسی لبرل منصوبے کے تحت ٹھیک کی جاسکتی ہیں۔ اس میں مغرب اور اسرائیلی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ عہدے دار، ادارے کے رکن ہونے کے ناتے یکساں پابند ہیں۔ مغرب میں یہ امر فلسطینیوں کے ساتھ اظہار یک جہتی سے زیادہ کسی بھی ایسے فرد کے لیے خود کو بچانے کے لیے بھی ایک ناگزیر عمل ہے، جو یونیورسٹیوں کو ریاستی جبر سے آزاد، حقیقی سیاسی تنقید کے مراکز سمجھتا ہو۔

"Resisting the Israelisation of Western universities". ("overland.org.au". May 6, 2024)

بقیہ: اسرائیلیوں کے معیارِ زندگی کی قیمت کون چکاتا ہے؟

امریکی فوجی امداد کی ایک وجہ اسرائیل کو مشرق وسطیٰ میں کوالٹیٹیو ملٹری ایج (کیو ایم ای) فراہم کرنا ہے۔ یہ قانون، جو ۲۰۰۸ء میں امریکی کانگریس نے پاس کیا، اس کے مطابق اسرائیل کو امریکا کے جدید ترین فوجی ہتھیاروں اور پلیٹ فارمز تک رسائی کا حق دیا گیا۔ جوش پال جیسے کئی امریکی حکومتی اہلکاروں کے حالیہ استعفوں نے اب صورت حال تبدیل کردی ہے۔

یہ امریکا اسرائیل تعلقات کے درمیان بڑھتی ہوئی بے چینی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست مشی گن کے شہر ہیم راک کی سٹی کونسل نے حال ہی میں اسرائیلی مصنوعات کے بائیکاٹ کا اعلان کردیا جس کی رو سے شہر میں اب کوئی اسرائیلی مصنوعات بیچ نہیں سکے گا۔ شاید اب وقت آگیا ہے کہ امریکا اسرائیل کو خطے میں امن قائم کرنے اور ایک عام ملک کی طرح رہنے پر مجبور کرنے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۵ جون ۲۰۲۴ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کا شائع کردہ جدید ایڈیشن

حدیثِ نبویؐ اور سائنسی علوم

قیمت: ۵۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون 021-36809201

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ نئی کتاب

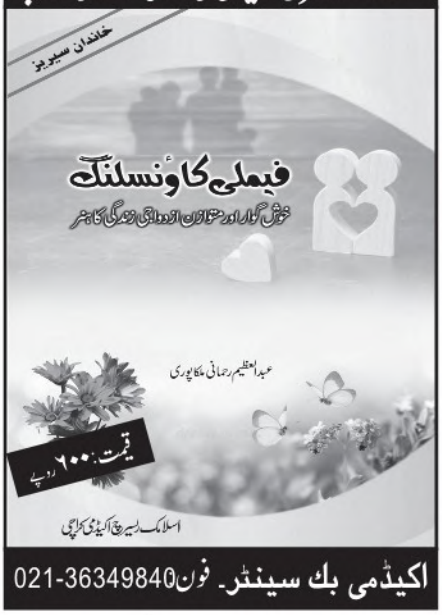

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون 021-36349840

مودی کی کامیابی، جنوبی ایشیا میں امریکی اسٹریٹجک پوزیشن

عبدالباسط خان

بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) نے مسلسل تیسری مرتبہ کامیابی تو حاصل کرلی لیکن سادہ اکثریت لینے میں ناکام رہی ہے اور مودی کو اپنی دیگر اتحادی جماعتوں پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔

درحقیقت ایک کمزور وزیراعظم کے طور پر مودی اپنی اندرونی کمزوری کی تلافی کے لیے امریکا کے ساتھ اتحاد پر زیادہ انحصار کریں گے۔ مودی کی جیت دہلی اور واشنگٹن کے بڑھتے ہوئے اسٹریٹجک اتحاد کے تسلسل کو یقینی بنائے گی اور چین پر قابو پانے کے لیے اسٹریٹجک تعلقات کو مزید گہرا کرے گی۔

موجودہ تناظر میں جنوبی ایشیا میں چین کے مسائل بڑھ رہے ہیں کیونکہ چین پاکستان اقتصادی راہداری (CPEC) کی سست رفتار ترقی اور چینی منصوبوں اور شہریوں پر بڑھتے ہوئے دہشت گردانہ حملوں کی وجہ سے پاکستان کے ساتھ اس کے تعلقات تناؤ کا شکار ہیں۔

امریکا کے بھارت کے ساتھ بڑھتے گٹھ جوڑ اور چین اور پاکستان کے ٹوٹتے ہوئے تعلقات نے واشنگٹن کے لیے جنوبی ایشیا میں اپنے اسٹریٹجک اہداف کو حاصل کرنے کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا ہے۔

جنوبی ایشیا کے تیزی سے ابھرتے ہوئے معاشی اور اسٹریٹجک ماحول نے امریکا میں ایک بڑی تبدیلی کو جنم دیا ہے۔ بڑھتی ہوئی طاقت کے عدم توازن، بہت بڑی معاشی تفاوتوں کے ساتھ ساتھ اسٹریٹجک ترجیحات کو تبدیل کرنے کی وجہ سے، امریکا نے پاکستان بھارت تعلقات کے توازن کو غیر متعلق کردیا ہے۔

چین پر قابو پانے کے امریکا کے طویل المدتی اسٹریٹجک مفادات بھارت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان اقتصادی اور تزویراتی دونوں لحاظ سے چینی کیمپ میں جکڑا ہوا ہے۔

اگست ۲۰۲۱ء میں افغانستان سے انخلا کے بعد واشنگٹن کے لیے اسلام آباد کی اسٹریٹجک اہمیت کم ہوگئی ہے۔ امریکا افغانستان میں اپنی شکست کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہراتا ہے اور دہشت گردی کے دوبارہ سر اٹھانے کو طالبان کی حامی افغان پالیسی کے فطری نتیجے کے طور پر دیکھتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی، اقتصادی ڈیفالٹ سے بچنے کے لیے پاکستان کے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ پر انحصار نے امریکا کو بھارت اور پاکستان کے تعلقات کو خراب نہ ہونے کے لیے کافی اسٹریٹجک اسپیس فراہم کی ہے۔

۲۰۲۱ء میں لائن آف کنٹرول (ایل او سی) پر بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ بندی معاہدے کی بحالی نے پاکستان کو پاک افغان سرحد پر دوبارہ پیدا ہونے والی دہشت گردی کے خلاف جنگ پر توجہ مرکوز رکھنے میں مدد کی اور اسی طرح بھارت نے کشمیر سے اپنے کچھ فوجیوں کو ہمالیہ کے علاقے میں چین کی سرحد پر منتقل کیا۔

امریکا پاک۔ بھارت تعلقات میں اس جمود کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ بھارت کے لیے دو محاذوں کی صورتحال پیدا نہ ہو، اور چین اور پاکستان کے ساتھ قریب قریب بیک وقت فوجی بحران پیدا نہ ہوسکے۔

جنوبی ایشیا کے موجودہ اسٹریٹجک ماحول نے امریکا کو اپنے اسٹریٹجک مفادات آگے بڑھانے کے لیے ایک مثالی پوزیشن میں چھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر، مذاکرات کے ۲۰ ادوار کے باوجود بھارت اور چین کی اپنے اختلافات کو حل کرنے میں سفارتی ناکامی نے دہلی کا واشنگٹن پر انحصار مزید گہرا کردیا ہے۔

مزید برآں، امریکا نے چین مخالف اتحاد کو مضبوط کرنے کے لیے دو محاذوں کی صورتحال میں پھنس جانے کے بھارتی خوف کو کافی استعمال کیا ہے۔

اسی طرح پاکستان کی معاشی بقا آئی ایم ایف کے بیل آؤٹ پیکیجز کے حصول کے لیے واشنگٹن کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھی۔

پاکستان کے ساتھ امریکا کے تعلقات کا بنیادی مرکز اس وقت چین جبکہ دوسرا افغانستان میں دہشت گردی ہے۔ اقتصادی محاذ پر، امریکا نے بار بار پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ آئی ایم ایف کے قرضوں کو چین کو ادا کرنے کے لیے استعمال نہ کرے، چین انڈی پینڈنٹ پاور پروڈیوسرز (آئی پی پیز) کے ساتھ شراکت کی شرائط پر دوبارہ بات چیت کرے تاکہ ان کی پیداواری لاگت کو مقامی پاور کمپنیوں کے مساوی بنایا جاسکے۔

اسی طرح، افغانستان میں دہشت گردی کی لہر، خاص طور پر تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) اور داعش خراسان (ISK) کے حملے، امریکا اور پاکستان کے تعلقات کا دوسرا پہلو ہیں۔

دونوں ممالک نے اپنی پالیسیوں کو ہم آہنگ کرنے کے لیے انسداد دہشت گردی کے لیے مذاکرات کیے ہیں۔ پاکستان کے لیے، ٹی ٹی پی سب سے بڑی تشویش ہے، جبکہ داعش خراسان کے افغانستان سے باہر حملے کرنے کی صلاحیت امریکا کے لیے تشویش کا باعث ہے۔

واشنگٹن کا خیال ہے کہ داعش خراسان تین سے چھ ماہ کے عرصے میں افغانستان سے امریکی سرزمین پر دہشت گرد حملہ کرسکتا ہے۔

دوسری طرف، بھارت۔امریکا تعلقات زیادہ کثیر جہتی، متنوع اور جامع ہیں، بھارت اور امریکا اور دونوں ہی چین کے خلاف مشترکہ سوچ رکھتے ہیں۔ اس طرح چین کی جگہ لے کر عالمی اقتصادی مرکز میں ابھرنے کی بھارت کی خواہش نے اسے مغرب کے مزید قریب تر کیا ہے۔

لچکدار اور متنوع سپلائی چینز کے لیے اپنے گوداموں اور صنعتی مراکز کو چین سے منتقل کرنے کی مغرب کی خواہش نے بھارت کے لیے ایک موقع پیدا کیا ہے۔ دہلی کی ابھرتی ہوئی معیشت، سستی مزدوری کی لاگت اور امریکا کے ساتھ بڑھتی ہوئی قربت اسے مغربی صنعتوں اور گوداموں کو منتقل کرنے کے لیے ایک مثالی جگہ بنانے میں مدد کرسکتی ہے۔

مستقبل قریب میں جنوبی ایشیا کے اسٹریٹجک ماحول کی روانی علاقائی اور عالمی طاقتوں کے درمیان اتحاد اور دشمنیوں کی ایک پیچیدہ صورتحال کو جنم دے گی۔

اس وقت پاکستان کی مکمل توجہ اپنی معیشت کو ٹھیک کرنے پر اور عالمی طاقتوں کی رسہ کشی سے حتی الامکان گریز اور دہشت گردی پر قابو پانے پر ہونی چاہیے۔

(بحوالہ: ''دی انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۰ر جون ۲۰۲۴ء)

بچوں کے ذہنی ونفسیاتی امراض ومسائل کا مختصر جائزہ

بچوں کے ذہنی امراض

فوزیہ عباس

قیمت: ۳۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون 021-36809201

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950